اسلام
اور عصرِ جدید

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی-۲۵

اسلام اور عصرِ جدید

مدیر

اقتدار محمد خاں

نائب مدیر

محمد سعید انور

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

(جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر)

جلد نمبر: ۵۵ جولائی ۲۰۲۳ء شمارہ: ۳

ISSN 2278-2109

اعانت زر کی شرحیں

	فی شمارہ	سالانہ	
اندرون ملک	100/روپے	380/روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان و بنگلہ دیش	4/امریکی ڈالر	15/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	12/امریکی ڈالر	40/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے)

حیاتی رکنیت

اندرون ملک	5000/روپے
پاکستان و بنگلہ دیش	150/امریکی ڈالر
دیگر ممالک	400/امریکی ڈالر

اس شمارے کی قیمت 100/روپے

پرنٹنگ اسسٹنٹ: راشد احمد **ٹائٹل:** ارتج گرافکس

© جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ
مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

پتہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

Website: www.jmi.ac.in/zhiis E-mail:zhis@jmi.ac.in

طابع وناشر: **پروفیسر اقتدار محمد خاں** اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

بانی مدیر

ڈاکٹر سید عابد حسین (مرحوم)

مجلسِ ادارت

پروفیسر نجمہ اختر (صدر)

- پروفیسر طلعت احمد
- نجیب جنگ آئی۔اے۔ایس (ریٹائرڈ)
- سید شاہد مہدی آئی اے ایس (ریٹائرڈ)
- لیفٹیننٹ جنرل محمد احمد ذکی (ریٹائرڈ)
- پروفیسر اختر الواسع
- پروفیسر محمود الحق
- پروفیسر سلیمان صدیقی

فہرست

- حرف آغاز — اقتدار محمد خاں — ۷
- ایمان سرچشمۂ سکون واطمینان — سید محمد کاظم نقوی — ۱۵
- شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ — رضی احمد کمال — ۳۳
- عمرانیاتِ حدیث کا عصری مطالعہ — عبیداللہ فہد — ۶۱
- اسلامی نقطۂ نظر سے توریت اور بائبل کی حقیقت — فضل الرحمٰن اصلاحی قاسمی — ۹۷
- ہندوستانی مذاہب پر مسلم علماء کا تحریری سرمایہ — ظفر دارک قاسمی — ۱۳۹

حرف آغاز

ام المومنین سیدہ ام سلمہ کا نام رملہ یا ہند، لقب، ام المؤمنین اور کنیت ''اُمِ سلمہ'' ہے مگر یہ اپنی کنیت کے ساتھ ہی زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کے والد کا نام ''حذیفہ'' اور بعض مؤرخین کے نزدیک ''سہل'' ہے مگر اس بات پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ ان کی والدہ کا نام ''عاتکہ بنت عامر'' ہے۔ والد کی طرف سے سلسلہ نسب حسبِ ذیل ہے: ام سلمہ بنت ابوامیہ حذیفہ (بعض مؤرخین کے نزدیک سہیل ہے) بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم بن لقیظہ بن مُرہ بن کعب تھا۔ قریش کی ایک شاخ ''بنومخزوم'' سے آپ کا تعلق تھا۔ والد محترم مکے کے دولت مند لوگوں میں سے تھے جو بڑے مخیّر اور فیاض تھے، سفر میں جاتے تو تمام قافلہ والوں کی کفالت خود کرتے اسی لیے آپ کا لقب ''زادالراکب'' مشہور تھا۔ والدہ کی طرف سے سلسلہ نسب حسبِ ذیل ہے: ام سلمہ

بنتِ عاتکہ بنت عامر بن ربیعہ بن مالک۔ سیدہ ام سلمہ والد اور والدہ دونوں طرف سے ''قریشی'' تھیں۔ آپ کی ولادت نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے نو سال قبل عام الفیل میں ہوئی۔ آپ کی پرورش ابوامیہ جیسے سخی باپ کی آغوشِ تربیت میں بڑے ناز ونعم سے ہوئی۔ آپ شادی تک نہایت آرام وآسایش کی زندگی بسر کرتی رہیں۔

آپ کا نکاح پہلے حضرت ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوا تھا جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی تھے۔ یہ دونوں میاں بیوی اعلانِ نبوت کے بعد جلد ہی دامن اسلام میں آ گئے تھے۔ چنانچہ ایک دن آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دارِ بنی اَرقم میں چند صحابہ کے ہمراہ تشریف فرما تھے، اسی دوران حضرت ابوسلمہ اپنی بیوی ام سلمہ کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے۔ آپؐ نے ان کے آنے پر خوشی کا اظہار فرمایا اور اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، اور دونوں کو قرآن کریم کی چند آیات پڑھ کر سنائیں، قرآن مجید سننے کے بعد حضرت ابوسلمہ نے کہا: ''بھائی کے رشتے سے میرا بھی یہ حق بنتا ہے کہ میں بھی اس روشنی سے اپنی روح کو منور کروں جس سے دوسرے فیض حاصل کر رہے ہیں۔'' جب یہ الفاظ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنے تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مبارک چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا، حضرت ابوسلمہ نے دوبارہ عرض کیا: ''ہم دونوں میاں بیوی کو مسلمان کر کے اپنی خدمت کے لیے قبول کر لیجیے۔'' اس طرح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر نے اسلام قبول کیا اور دس کے بعد گیارہویں نمبر پر اسلام قبول کر کے سابقین اولین

کی سعادت پائی۔

حضرت ام سلمہ اور حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہما کا تعلق عرب کے مشہور و معروف اور بڑے قبیلے سے تھا۔ ان کے والدین کا مقام پورے عرب میں بڑا اونچا تھا۔ لیکن جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو ان کے رشتے داروں نے ان سے تعلقات توڑ لیے اور انھیں طرح طرح سے اذیت پہنچانے لگے۔ ایسی ایسی سختیاں کی گئیں کہ جن کے تصور سے دل گھبرا اٹھتا ہے۔ تاریخ و سیرت کی کتابوں میں ایسے واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ جیسے جیسے ان پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جاتے ویسے ویسے ان کی اسلام سے محبت اور ثابت قدمی میں اضافہ ہوتا جاتا۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان جاں نثاروں نے ہر ظلم و ستم کو ہنس ہنس کر برداشت کیا۔ اعلانِ نبوت کے پانچویں سال رجب کے مہینے میں کفار و مشرکین کے ظلم و ستم عروج پا چکے تھے۔ آخر کار نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی اجازت عطا فرما دی کہ جو مکہ مکرمہ چھوڑ کر جانا چاہے حبشہ چلا جائے کیوں کہ وہاں کا بادشاہ نجاشی بڑا انصاف پسند اور کشادہ قلب ہے۔ لہٰذا گیارہ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل چھوٹا سا قافلہ اپنے وطن مکہ مکرمہ کو الوداع کہتے ہوئے حبشہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس قافلے کے امیر حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ تھے۔ اسلام کی اِس سب سے پہلی ہجرت میں حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی حضرت ام سلمہ بنت ابو امیہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں۔

اعلانِ نبوت کے چھٹے سال کے شروعات کی بات ہے کہ

کفار ومشرکین کو جب اس بات کی خبر ملی تو انہوں نے بہت کوشش کی کہ مسلمان مکہ مکرمہ سے کسی بھی صورت ہجرت نہ کرسکیں۔ انھوں نے مکہ سے نکلنے والے تمام راستوں پر سخت پہرے بٹھا دیے لیکن ان سب کے باوجود ۸۳ مرد اور ۲۰ عورتیں مکہ سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے اور حبشہ پہنچ کر سکون واطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔ یہاں انہیں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔ حبشہ کی طرف ہونے والی اس دوسری ہجرت میں بھی حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا شامل تھیں جنہوں نے اسلام کے لیے دوبارہ اپنا آبائی وطن چھوڑا۔ حبشہ کی طرف ہونے والی اس دوسری ہجرت نے پہلی ہجرت کی بہ نسبت مکہ کے لوگوں پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام کے کٹر دشمنوں کے بیٹے بیٹیوں نے اسلام قبول کرلیا تھا اور انھیں وہ لوگ طرح طرح کی اذیتیں دے رہے تھے۔ وہ سب کے سب حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ یہ ایسے تھے کہ ان کی جدائی انھیں برداشت نہ ہوسکی۔ مکہ کے مشرکین پریشان ہو اٹھے کہ آخر اسلام میں ایسی کون سی بات ہے کہ مسلمان ہو جانے کے بعد وہ اپنے ماں باپ، بہن بھائی، مال ودولت اور وطن تک کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن اسلام نہیں چھوڑتے.

آخر کار اعلانِ نبوت کا تیرہواں سال تھا کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نام لیواؤں کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ چناں چہ مسلمانوں نے مدینے کی طرف ہجرت شروع کی۔ سب سے پہلے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت ابوسلمہ اور حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ

ہجرت کے سفر پر روانہ ہوئے۔

حضرت امّ سلمہؓ کے پہلے شوہر حضرت ابوسلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی وفا شعار صحابہ میں سے تھے۔انہوں نے غزوہ بدر میں شامل ہونے کی توفیق پائی اور شجاعت کے جوہر دکھائے، غزوۂ احد میں بھی حضورؐ کے ساتھ کمال وفا اور اخلاص کے ساتھ شرکت کی اور استقامت کا نمونہ دکھایا۔غزوہ اُحد میں حضرت ابوسلمہؓ کو ایک بہت گہرا زخم بازو پر آیا تھا جو ایک عرصہ تک مندمل نہ ہوا۔تقریباً ایک ماہ کے علاج کے بعد اچھا ہوا۔سنہ ۳ر ہجری کے آخر میں حضورؐ نے حضرت ابوسلمہ کو ڈیڑھ سو سواروں کا امیر مقرر کر کے قطن کے پہاڑ کی طرف ایک مہم پر روانہ فرمایا۔ ایک مہینہ کے قریب آپؓ اس مہم پر رہنے کے بعد مدینہ واپس لوٹے تو دوبارہ وہی زخم ہرا ہوگیا۔ بالآخر اسی بیماری میں سنہ ۴ر ہجری میں آپؓ کی وفات ہوئی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے پہلے شوہر حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے بے پناہ محبت والفت تھی۔

پہلے شوہر کے انتقال کے وقت حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا امید سے تھیں۔ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام زینب رکھا گیا۔ اس کی ولادت پر عدت بھی ختم ہوگئی۔عدت گذر جانے کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نکاح کا پیغام لے کر آئے۔اس پر انھوں نے یہ عذر کیا کہ میرے بچے زیادہ ہیں، میری عمر بھی زیادہ ہے، کوئی میرا وارث بھی نہیں اور میرے مزاج میں غیرت بھی بہت ہے۔اس کے جواب میں نبیِ کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب بھیجا کہ عمر کی بات تو یہ ہے کہ میری عمر تم سے زیادہ ہے اور بچوں کا اللہ نگہبان ہے ان کی پرورش میں تمہیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ میں بھی ان کا خیال رکھوں گا اور اللہ سے دعا کروں گا کہ تمہاری غیرت والی بات جاتی رہے۔ تمہارا کوئی ولی میرے ساتھ رشتے کو ناپسند نہیں کرے گا۔ اس کے بعد حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے یہ پیغام قبول کر لیا۔ چناں چہ شوال ۴ھ کی آخری تاریخوں میں آپ کا نکاح نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو گیا اور آپ ''ام المؤمنین'' کے لقب سے سرفراز ہوئیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جب نکاح ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسی حجرے میں ٹھہرایا جس میں ام المساکین حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا رہا کرتی تھیں۔ انھوں نے وہاں دیکھا کہ ایک مٹکے میں جَو رکھے ہیں اور ایک چکّی اور ہانڈی بھی موجود ہے۔ لہٰذا خود جَو پیسے اور چکنائی ڈال کر مالیدہ بنایا اور پہلے ہی دن نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مالیدہ کھلایا جسے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حسن و جمال کے ساتھ ساتھ عقل و فہم کے کمال کا بھی ایک بے مثال نمونہ تھیں۔ صلح حدیبیہ کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ اپنی اپنی قربانیاں کر کے سب لوگ احرام کھول دیں اور بغیر عمرہ ادا کیے سب لوگ مدینہ واپس چلے جائیں کیونکہ اسی شرط پر صلح حدیبیہ ہوئی ہے، تو لوگ اس قدر رنج و غم میں تھے کہ ایک شخص بھی قربانی کے لیے تیار نہیں تھا۔ حضورِ اقدسؐ کو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اس طرزِ عمل سے روحانی کوفت ہوئی اور

آپ نے معاملے کا حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تذکرہ کیا تو انھوں نے یہ رائے دی کہ یا رسول اللہؐ آپ کسی سے کچھ بھی نہ فرمائیں اور خود اپنی قربانی ذبح کر کے اپنا احرام اتار دیں۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا۔ یہ دیکھ کر کہ حضورؐ نے احرام کھول دیا ہے سبھی صحابہ نے بھی اپنی اپنی قربانیاں کر کے احرام اتار دیا اور سب لوگ مدینہ منورہ واپس چلے گئے۔

حسن و جمال اور عقل و رائے کے ساتھ ساتھ فقہ و حدیث میں بھی ان کی مہارت خصوصی طور پر ممتاز تھی۔ تین سو اٹھتر حدیثیں انھوں نے رسول اللہؐ سے روایت کی ہیں اور بہت سے صحابہ و تابعین حدیث میں ان کے شاگرد ہیں۔ ان کے شاگردوں میں حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی شامل ہیں۔

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی تمام زندگی اسلام کی خدمت اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرماں برداری میں بسر کی۔ مدینہ منورہ میں ۸۴ برس کی عمر پا کر آپ نے وفات پائی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپ کے وصال کے سال میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۵۳ھ بعض نے ۵۹ھ بعض نے ۶۲ھ لکھا ہے اور بعض کا قول ہے کہ آپ کی وفات ۶۳ھ میں ہوئی۔ ازواجِ مطہرات میں سب سے آخر میں آپ ہی نے وفات پائی۔ آپ کا مزار جنت البقیع میں ہے۔

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی صبر و

استقامت، علم و عمل، جوشِ اسلامی، محنت و جفاکشی اور عقل و دانش
کا ایک روشن باب ہے۔ جس کی مثال مشکل ہی سے مل سکے گی۔
ان کے کارناموں اور بہادری کی داستانوں کو تاریخِ اسلام کے
صفحات پر دیکھ کر ان کی زندگی کے شب و روز پر عمل کرتے ہوئے
ہماری ماؤں بہنوں کو اپنی زندگی نکھارنا اور سنوارنا چاہیے۔

اقتدار محمد خاں

سید محمد کاظم نقوی *

ایمان سرچشمۂ سکون واطمینان

بعض جدید تعلیم یافتہ اشخاص کہتے ہیں کہ ہم خدا، مذہب اور ماوراء طبیعت مسائل کے متعلق کیوں غور وخوض کریں؟ ایسے موجودات جو احساس اور تجربے کے دائرے سے باہر ہیں جن کے ہونے اور نہ ہونے کا ہماری زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ ہیں تو کیا اور نہیں ہیں تو کیا؟ ان کے متعلق تحقیق کرنے کا نتیجہ صرف اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا ہے۔

ایک عقل مند آدمی کو ایسے مسائل کے متعلق غور وخوض کرنا چاہیے جن کا انسان کی زندگی سے تعلق ہے۔ جن کی گرہ کشائی اس کی زندگی کو بہتر بنا سکے۔ ہمارا بس مادّے اور نیچر سے سابقہ ہے ان کے علاوہ دوسرے مسائل کے متعلق غور وفکر کرنا حماقت ہے۔

ایسے اشخاص کا خیال ہے کہ جن لوگوں نے اپنے لیے کسی مذہب کو پسند کرلیا ہے ان کا فرض ہے کہ اپنی رفتار وگفتار بلکہ اپنے افکار وخیالات تک میں اس مذہب کے اصول وقوانین کی حتی الامکان پابندی کریں۔ ان کی زندگی کے تمام انفرادی اور معاشرتی شعبوں میں دینی تعلیمات کی جھلک نظر آنا چاہیے۔ ہماری عقل ان کے واسطے ضروری قرار دیتی ہے کہ ان کا کوئی عمل مذہبی حدود وقیود کے باہر نہ ہو۔ لیکن ایسے

* سابق پروفیسر، شعبۂ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

آزاد خیال اشخاص کے لیے مذہب کے متعلق تحقیق ہرگز ضروری نہیں ہے جنھوں نے مذاہب عالم میں سے ابھی کسی دین کا انتخاب نہیں کیا ہے جو ابھی کسی تعلیم اور قانون کے پابند نہیں ہوئے ہیں۔ کیا انسانی زندگی فطری طور پر انسانی اور ان کے مختلف معاشرے بلا مخصوص مذہبی اصول اخلاق کے اپنے حقیقی کمالات کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے؟ آخر کیا ضروری ہے کہ بیٹھے بٹھائے لوگ مذہب کی بابت تحقیق کا دردِ سر مول لیں۔ اپنی آزادیوں کو پابندی سے بدلیں؟ اپنی راحتوں کو خیر باد کہہ کر زحمتوں اور تکلیفوں میں گرفتار ہوں؟

غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس خیال کی حیثیت ایک غلط فہمی سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کو مختلف رخوں سے دور کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ کمال کی تلاش فطری ہے

ہر وہ شخص جسے انسان کہا جا سکے اپنی عقل اور فطرت کے اشاروں سے منزلِ کمال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ انسان جس فضا، جس ماحول میں بھی ہو عقل و فطرت کے بنائے ہوئے اس راستے سے بال برابر ہٹتا نہیں ہے۔ اس کے ذاتی اور سماجی حالات میں جتنا چاہے تغیر و تبدل ہو لیکن اس کے خط سیر میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ایک طالب علم جو یونیورسٹی میں تحصیلِ علم کر رہا ہے، ایک مزدور جو کسی فیکٹری کے اندر اپنے کام میں سرگرمی کے ساتھ مشغول ہے، ایک بڑا عالم جو برابر کتابوں کے مطالعہ اور گہرے علمی مطالب کی تحقیق میں منہمک ہے، ایک سائنس داں جو تجربہ گاہوں کے طاقت فرسا ماحول میں طرح طرح کی آزمائشیں کر رہا ہے، یہ سب کے سب اپنی منزلِ کمال تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اپنی ذات اور قوم کے لیے ایک شاندار، تابناک مستقبل کی آرزو کروٹیں بدل رہی ہے۔ اسی نے انہیں ان جانفشانیوں اور غیر معمولی محنتوں پر آمادہ کیا ہے۔ چوں کہ ان میں سے ہر ایک کا مقصد کمال ہے اس لیے اس تک پہنچنے کے سلسلے میں ہر تکلیف و رنج ان کے واسطے راحت و مسرت کا سامان ہے۔ فطرت کی آواز اور عقل و ضمیر کا حکم ان لوگوں کا پشت پناہ اور مددگار ہے۔

تلاش کمال کا یہ جذبہ نوع انسانی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ حیوانات میں بھی مکمل طور سے موجود ہے۔ وہ بھی اپنے کمال کے خواستگار ہیں۔ وہ بھی اپنی منزل کمال کی طرف رواں دواں ہو کر ہر قسم کی رکاوٹوں کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایسی چیزوں کو چاہتے ہیں جو ان کی زندگی کے ساتھ سازگار ہوں۔ وہ ایسی چیزوں سے ہمہ وقت فراری ہیں جو ان کے فطری تقاضوں کو

نقصان پہنچائیں۔اس بارے میں انسان اور جانور کے درمیان صرف یہ فرق ہے کہ کمال خواہی کا جذبہ جانور کی بہ نسبت انسان میں زیادہ طاقتور ہے۔اس کی وجہ ظاہر ہے کہ انسان کی رہبری کے لیے عقل موجود ہے جس سے بیچارہ جانور محروم ہے۔

کمال طلبی کا یہ جذبہ اتنا ہمہ گیر ہے کہ اس کے دائرے سے کوئی انسان باہر نہیں ہے۔زیادہ صحیح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ تمام افراد انسانی کی دلی خواہش ہے کہ وہ اپنی منزل کمال کی جانب آگے بڑھیں۔ان کی تمام کوششیں اور کاوشیں اسی راہ میں ہوں۔شاید ساری دنیا میں ڈھونڈھنے کے بعد کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ ملے جسے فائدے اور کمال سے نفرت ہو، جو ایسی چیزوں کی طرف بڑھ رہا ہو جن سے اسے نقصان پہنچے۔کسی اور کا کیا ذکر اس اصول سے وہ لوگ تک مستثنیٰ نہیں ہیں جو انتہا سی قابلِ نفرت و ذلیل کاموں کا ارتکاب کیا کرتے ہیں، جو اپنی قیمتی زندگی کو وقتی لذت اندوزی کی خاطر تباہ کر دیتے۔جو نشیلی چیزوں کا استعمال کر کے اپنے تمام اعضاء رئیسہ کو بیکار بنا لیتے ہیں۔یہ لوگ بھی بخیال خود کمال کی طرف بڑھ رہے ہیں۔یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے راہِ کمال سے بھٹک کر اپنی قوتوں کا سرمایہ انہی پست کاموں کو سمجھ لیا ہے۔

معلوم ہوا کہ تمام افراد انسانی بلا استثناء کمال کی تلاش میں ہیں۔اِس سلسلے میں ان کی دوڑ دھوپ کی محرک دو چیزیں ہیں۔ایک صدائے فطرت، دوسرے فرمانِ عقل۔

صحیح تعلیم وتربیت سے محرومی کی بنا پر یہ ممکن ہے کہ یہ سمجھنے میں انسان سے چوک ہو جائے کہ اس کے لیے کمال کیا چیز ہے؟ ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے حقیقی کمال کا راستہ طے کرنے کے بجائے انحطاط اور تنزل کے راستے پر چلنے لگے۔

ذہنی اور دماغی کمال

بدیہی بات ہے کہ انسان کی معلومات جتنی بلند ہوں گی اتنی ہی اس کی قوت فکر بلند اور کامل ہوگی کیوں کہ انسانی عقل وفکر کا اپنی معلومات سے بڑا قریبی تعلق ہے۔جس قدر انسانی معلومات کا دائرہ وسیع ہوگا اسی کے مطابق عقل انسانی کے دائرے میں وسعت ہوگی۔دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ انسانی معلومات کی ترقی اور بلندی خود ذہنی اور دماغی طاقت کی ترقی ورفعت ہے۔اس گفتگو کا یہ نتیجہ نکلا کہ کامل ترین عقل وفکر وہ ہے جو بلند ترین موجودات کی طرف متوجہ ہو اور پست ترین عقل وہ ہے جو

انتہائی پست موجودات کی جانب متوجہ ہو۔

اس حقیقت کا پورا اندازہ اس وقت ہوگا جب آپ ایک دیندار اور بے دین شخص کے عقائد ونظریات کا ایک دوسرے سے موازنہ فرمائیں۔

مذہب سے بیگانہ شخص کے خیالات یہ ہیں:

''یہ عالم انہی چیزوں میں محدود ہے جنھیں ہم دیکھ رہے ہیں یا جن کو نیچرل سائنس نے ثابت کیا ہے۔ محدود نیچر اور اس کے جبری قوانین نے اس عالم کو بنایا ہے۔ اس کے وجود میں آنے کے لیے کسی فکر وشعور کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کائنات کو جس طاقت نے پیدا کیا ہے وہ ایک کمسن بچے کے برابر بھی عقل کی مالک نہیں ہے۔ انسان بھی اسی کائنات کا ایک جز ہے۔ مرنے کے بعد اس کے تمام اجزاء تتر بتر ہوکر دوسری مرتبہ انہی مواد طبیعیہ میں مل جائیں گے۔ انسان کسی حیثیت سے بھی باقی رہنے والا نہیں ہے۔ اس کے اور دوسرے حیوانات کے درمیان کوئی غیر معمولی فاصلہ نہیں ہے۔ وہ انہی جانوروں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔''

اس کے برخلاف ایک دیندار شخص کے عقائد ملاحظہ فرمایئے:

''جو چیزیں ہمارے مشاہدے میں ہیں عالم ان سے بہت زیادہ بڑا ہے۔ ماوراء الطبیعۃ کائنات اس جہان طبیعت سے وسیع تر ہے۔ اس عالم کی بنانے والی طاقت غیر معمولی علم وقدرت کی مالک ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس نظام عالم کی پشت پر ایک غیر محدود عقل وشعور کا ہاتھ ہے۔ کائنات اور ہر ذرّے میں بے شمار اسرار پوشیدہ ہیں۔ ان سے پورے طور پر ہمارا مخالف نہ ہونا ان کے نہ ہونے کی دلیل نہیں بلکہ ہماری نادانی کی دلیل ہے۔ انسان اور دوسرے حیوانات کے درمیان بڑا فاصلہ ہے۔ موت کے معنی بالکل نیست ونابود ہوجانے کے نہیں ہیں۔ موت انسان کے منازل کمال میں سے ایک منزل ہے بلکہ مرنے کے بعد انسان ایک وسیع اور بلند تر عالم میں قدم رکھتا ہے۔''

فی الحال ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ان دونوں میں سے کون صحیح طور پر پہنچتا ہے اور

کون غلط طور پر؟ ہمارا اس وقت مقصد یہ ہے کہ ہم اس کا فیصلہ کریں کہ ان دونوں میں سے کس کی عقل زیادہ کامل، کس کی روح زیادہ طاقت ور ہے؟ آیا وہ شخص کامل ہے جس کی عقل صرف مادّے کی چار دیواری میں گھوم رہی ہے یا وہ شخص کامل ہے جس کی عقل ابدیت کے آسمانوں میں، ایک غیر محدود فضا میں پرواز کر رہی ہے؟ اس سوال کا جواب بلا عرض کیے ہوئے ہر صاحبِ عقل کے سامنے ہے۔ یقیناً مذہبی وہ ہے جو مادّی افکار سے بلند تر فضا میں انسانی عقل وشعور کو پرواز کا موقع دیتا ہے۔ دین وہ ہے جو روح کو طاقتور بناتا اور انسان کی ہمت بلند کرتا ہے۔

۲۔ نقصان سے بچنا فطری ہے

تاریخ عالم بتاتی ہے کہ انسان اپنے تمام ادوار زندگی میں یہ مانتا رہا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے، اس کا یہ عقیدہ انتہائی قدیم اور پختہ ہے۔ انسان کو کبھی اس کے صحیح ہونے کے متعلق شک نہیں ہوا۔ ہر زمانے میں ایسے لوگ بہت کم رہے ہیں جو اس کے قائل ہوں کہ اس عالم کی پیدائش میں علم وشعور اور ارادے کو دخل نہیں ہے۔ مشہور مصری عالم محمد فرید وجدی لکھتے ہیں:

> ''زمین کی کھدائی کے ذریعہ گزشتہ لوگوں کے آثار کی جتنی بھی جستجو کی جائے بت پرستی ان کے مدرکات اور معقولات میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ نیز خدا کے وجود کا اعتقاد انسان کے موجود ہونے کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔'' (دائرۃ المعارف ماہ وشن، ص: ۶۳۹)

خدا کے ماننے والوں کی کثیر اور عظیم جماعت میں صرف جاہل عوام نہیں بلکہ بڑے بڑے عالی قدر سائنس داں، بڑے بڑے بلند مرتبہ فلاسفہ، عظیم الشان محققین اور موحدین نظر آتے ہیں۔ وہ لوگ کہ جنھوں نے جدید تمدن کی بنیادیں رکھتے ہیں۔ موجودہ علوم وفنون کی رونق جن کی جانفشانیوں کا طفیل ہے، جن کے غیر معمولی علم ودانش کو ساری دنیا مانتی ہے۔ ایسے اشخاص ایک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ دنیا کا یہ نظام ایک عظیم عقل وفکر، ایک قادر اور طاقتور خالق کا اثر ہے۔ یہ عالمِ رنگ وبو کا حسن ولطافت یہ کائنات کے حیرت انگیز نقش ونگار ایک زبردست نقاش کے قلم قدرت کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ خالق عالم نے انسان کو ایک مخصوص غرض اور مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس نے انسان کی خلقت کا مقصد اپنے برگزیدہ پیغمبروں کے ذریعے بیان بھی کر دیا ہے۔ اس نے اس مقصد کو پورا

کرنے کی خاطر انسان کے واسطے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں۔اس کی جانب سے فرماں برداروں کے لیے ان کی اطاعت کے صلے اور نافرمانوں کے واسطے سزائیں متعین ہوئی ہیں۔دوسری طرف ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ بہت سے بلند کردار، پاک وطاہر سیرت کے اشخاص نے دعویٰ کیا کہ ہم خدا کے رسول اور اس کے سفیر ہیں۔ان کی زندگی کا پورا مرقع درخشاں نظر آتا ہے۔ان کے دامن پر کسی اخلاقی کمزوری کا دھبہ نہیں دکھائی دیتا۔ان کی شخصیت بلند اخلاق واوصاف کے لحاظ سے ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنا پیغام پہنچانے کے سلسلے میں کسی قسم کی فداکاری اور جانبازی میں دریغ نہیں کیا۔ان میں سے اکثر وبیشتر نے لوگوں کو اپنے راستے پر لانے کے لیے اپنی جانیں قربان کردیں۔ان کی یہ حیرت انگیز فداکاری اور قربانی پکار پکار کر اعلان کررہی ہے کہ وہ اپنے راستگو ہونے کا پختہ عقیدہ رکھتے تھے۔

ہمارے سامنے مذہبی عقائد کا جھنڈا ایک ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہے جس میں بڑے بڑے مفکرین، علوم وفنون کے عظیم ماہرین، ان کے علاوہ بلند اور پاکیزہ ترین اخلاق وصفات کے حامل اشخاص ہیں۔کیا عقائد مذہبی کے بارے میں اس گروہ کا متفق الکلمہ ہونا ہمارے لیے یہ ضروری نہیں قرار دیتا ہے کہ ہم ان کے بارے میں غور وخوض کریں؟ کیا یہ قرین قیاس ہے کہ ایسے عظیم المرتبت اشخاص غلط راستے پر گئے ہوں۔ان سب نے غلطی کی ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ ایسے بےلوث، بےغرض، پاک وطاہر اشخاص کی متفقہ رائے ہمارے دل میں ان کے خیال اور دعوے کے صحیح ہونے کا عقیدہ پیدا کرتی ہے۔کیوں کہ ان کے درمیان ہمیں ہزاروں سائنس داں، علم وصنعت کے ماہرین، بلند اخلاق وصفات کے مالک نظر آتے ہیں۔

انسان ان علوم وفنون کے ماہرین، تہذیب وتمدن کے بانیان، بلند انسانی اخلاق وصفات کے مظاہر کے متعلق کتنی ہی بدگمانی سے کام لے، لیکن اس کا ہرگز ہرگز انکار نہیں کرسکتا کہ کسی مسئلے میں ان کے متعلق الکلمہ ہونے سے کم از کم انسان کے دماغ میں یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ان کا عقیدہ صحیح ہو۔

آیا اس صورت میں جبکہ ہمیں یہ شک ہو کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے، جبکہ یہ شک ہو کہ اس نے انسان کو کسی غرض کے لیے پیدا کیا ہے، جبکہ یہ شبہ ہو کہ اس کا رشتۂ زندگی مرنے کے بعد نہیں ٹوٹتا، جبکہ یہ شبہ ہو کہ اس خالق نے انسان کے لیے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں، جبکہ یہ احتمال ہو کہ اس دنیا کے علاوہ ایک دوسرے عالم میں ہر شخص کو اس کے اچھے اور بُرے اعمال کی جزا اور سزا دی جائے گی، آیا

ان صورتوں میں یہ صحیح ہے کہ انسان معمولی چیزوں کے متعلق تحقیق کرے لیکن ان مسائل کے بارے میں تحقیق نہ کرے؟ ہر شے کے بارے میں سوچے لیکن مذہب کی بات نہ سوچے؟ ہر راز کو معلوم کرنے کی کوشش کرے لیکن یہ پتا چلانے کے درپے نہ ہو کہ وہ خود بخود وجود میں آ گیا ہے یا کسی طاقت نے اسے ارادے اور اختیار سے پیدا کیا ہے؟ کیا ہماری عقل ہمیں اجازت دیتی ہے کہ ہم خدا اور آخرت کے مسئلے سے چشم پوشی کر لیں؟ ایسا مسئلہ جس کا دائمی خوش بختی اور بدبختی سے تعلق ہے؟

دینا کا کوئی سنجیدہ انسان تحقیق کرنے سے پہلے یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ خدا، آخرت، جزا، سزا کے تمام مسائل ایک بے حقیقت اور محض خیالی چیز ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی غیر ذمہ دار شخص جرأت کر کے زبان سے ایسا کہہ دے لیکن اس کا دل گواہی دے گا کہ اس نے غلط کہا۔ ایسی صورت میں ایسے اہم مسئلہ کے متعلق ہماری عقل ہمارا کیا فریضہ قرار دیتی ہے؟ جو شخص ایسے عظیم الشان مسئلہ کے متعلق غور وخوض کرنے کے لیے آمادگی کا اظہار نہ کرے کیا اسے انسان کہا جا سکتا ہے؟

ہر قسم کے نقصان سے بچنا انسان کی فطرت کا مطالبہ ہے۔ چاہے وہ نقصان یقینی ہو اور چاہے احتمالی۔ ہم رات کو سونے کے لیے اپنے بستر پر جانا چاہتے ہیں۔ ایک چھوٹا بچہ چیخ کر کہتا ہے کہ سانپ، سانپ، سانپ۔ ہمارے بڑھتے ہوئے قدم رُک جاتے ہیں۔ ہم ٹھٹک کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ہم اس بستر پر اور شاید اس کمرے میں سونے پر تیار نہیں ہوتے۔ لیکن دنیا کے ہزاروں سائنسداں، ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر، کروڑوں اربوں صاحبان عقل وشعور ان کے ماننے والے ہم سے کہتے ہیں کہ خدا ہے۔ اس نے انسان کے لیے کچھ فرائض قرار دیے ہیں۔ اطاعت شعاروں کے واسطے بہشت اور اس کی نعمتیں، نافرمانوں کے لیے جہنم اور اس کی انتہائی دردناک تکلیف دہ سزائیں ہیں لیکن ان کے کہنے سے ہم اتنا بھی متاثر نہیں ہوتے جتنا ایک کم سن بچے کے کہنا کا اثر لیتے ہیں!!

۳۔ مذہب علوم وفنون کا محرک ہے

کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ علوم وفنون کا زمانہ ہے۔ تعجب ہے کہ اس علم ودانش کے درخشاں زمانے میں یہ کہا جاتا ہے کہ خدا اور ایسے ہی ماوراء طبیعت امور کے متعلق غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ خدا کا اعتقاد علم ودانش کا خالق، علم ودانش کا سرچشمہ، علم ودانش کا طاقتور محرک ہے۔ یہ عقیدہ کہ ایک علیم وحکیم طاقت نے اس عالم کو اپنے ارادے اور اختیار سے مخصوص اصول وقوانین کے مطابق

مرتب اور منظّم صورت سے پیدا کیا ہے، انسان کو تحقیق اور ریسرچ پر تیار کرتا ہے۔ اس کے برخلاف مادّی تفکر صرف یہی نہیں کہ انسان کو تحقیق کے لیے آمادہ نہیں کرتا بلکہ اس کے طائر (پرواز کرنے والے) فکر کو پرواز سے روکتا ہے۔

خدا پرستوں کا نظریہ ہے کہ اس عالم کو ایک قادر وتوانا ہستی نے پیدا کیا۔ اس کی خلقت ایک صحیح نظام کی بنیاد پر ہے۔ یہ عالم آفرینش کہ جو خدا کی کارگزاری کا نتیجہ ہے مرتب اور منظّم اصول وقوانین کے ماتحت وجود میں آیا ہے۔ اگر انسان تحقیق وجستجو کرے تو وہ برابر موجودات عالم کے پوشیدہ اسرار ورموز سے باخبر ہوتا رہے گا۔

اس خیال کے مقابلے میں مادّہ پرستوں کا نقطۂ نظر ہے کہ عالم آفرینش اندھے، بہرے، گونگے، ناسمجھ اتفاقات کا نتیجہ ہے۔ اس عالم کو پیدا کرنے والی طاقت ایک کمسن بچے کے برابر بھی عقل وشعور نہیں رکھتی ہے جو چیز بے عقل اور بے شعور قوت کا اثر ہو یقیناً اس کی خلقت میں کسی غرض اور مقصد کا لحاظ بے معنی بات ہے۔ اگر بالفرض عالم کے گوشہ وکنار میں کوئی ایسی چیز دستیاب ہوجائے جو منظّم اور مرتب صورت میں ہو تو یہ ایک اتفاق ہوگا۔ اتفاقات کے نتیجے میں نظم وترتیب کا موجود ہونا ایک ایسا انتہائی کمزور احتمال ہے جسے صفر کے برابر کہا جاسکتا ہے جو کسی عقلمند شخص کے باور کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ہمیں اس سے مطلب نہیں کہ خدا پرستوں کا نظریہ صحیح ہے یا مادّہ پرستوں کا نظریہ، ہم آپ سے صرف یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کون سا نظریہ موجوداتِ عالم کے اسرار ورموز کی تحقیق پر آپ کو آمادہ کرتا ہے؟ یہ نظریہ آپ کو تحقیق پر تیار کرتا ہے کہ تمام موجودات کو ایک صاحب عقل وشعور طاقت نے اپنے ارادے اور اختیار سے مخصوص اغراض ومقاصد کا لحاظ کرتے ہوئے منظّم اور مرتب شکل میں پیدا کیا ہے یا یہ نظریہ آپ کو چھان بین پر اُبھارتا ہے کہ یہ عالم بے شمار ایٹموں کے اتفاقاً اکٹھا ہوجانے کی وجہ سے وجود میں آگیا ہے؟ اس کی خلقت میں کسی ارادے کا دخل نہیں ہے۔ اس کے وجود کا کوئی مقصد نہیں ہے، اگر اس کی کسی چیز میں نظم وضبط دکھائی دے تو وہ اندھے، بہرے، ناسمجھ اتفاقات کا نتیجہ ہے؟

ظاہر ہے کہ صرف خدا پرستوں کا نظریہ وہ ہے جو انسان سے فرمائش کرتا ہے کہ آگے بڑھو اور اسرارِ طبیعت کا پتہ چلانے کی کوشش کرو۔ جب تک ایک محقق کے دل کی گہرائیوں میں یہ عقیدہ موجود نہ ہو کہ یہ عالمِ وجود مرتب ومنظّم ہے، اس میں علل ومعلولات اور اسباب ومسببات کے سلسلے موجود ہیں اس

وقت تک وہ ہرگز تحقیق وجستجو کی زحمت نہیں برداشت کرے گا۔

۴۔ مذہب اور اخلاق

انسان کی فطرت میں کچھ جذبات، میلانات اور رجحانات راسخ ہیں۔ انہی کے اوپر اس کی زندگی کا دارومدار ہے۔ ان میلانات اور رجحانات کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ نیست ونابود ہوجائے گا۔ لیکن یہ فطری میلانات اسی وقت انسانی معاشرے کی سعادت اور خوش بختی کا ذریعہ بن سکتے ہیں جبکہ وہ نقطۂ اعتدال پر ہوں۔ ان میں کسی قسم کی افراط وتفریط نہ ہو۔

عورت اور مرد کے اندر جنسی میلان فطری ہے۔ اس پر نسلِ انسانی کی بقا موقوف ہے لیکن اگر انسان اس فطری جذبے کو سیراب کرنے کے سلسلے میں معقول حدود کا لحاظ نہ رکھے تو اس کی تباہی وبربادی کا سبب بن جائے گا۔

حبّ نفس اور خودخواہی کے جذبہ میں یقیناً انسان کی بقا کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر انسان کو اپنی ذات سے محبت نہ رہے تو وہ اپنے کو باقی رکھنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کرے گا۔ پھر وہ خطروں میں گھرے گا اور انھیں اپنے سے دور کرنے کے واسطے کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ رفتہ رفتہ اس کا چراغِ زندگی خاموش ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر انسان کو اپنی ذات سے محبت حد اعتدال سے بڑھ جائے تو اس صورت میں بھی بدبختی کے سوائی کوئی نتیجہ آنکھوں کے سامنے نہیں آئے گا۔

غیظ وغضب کا جذبہ یقیناً فطرت کا عطیہ ہے۔ انسان کے باقی رکھنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ خطرے کے سامنے آنے کے بعد یہی غیظ وغضب کا جذبہ انسان کی تمام مادّی اور معنوی قوتوں کو دفاع کے لیے آمادہ کردیتا ہے۔ اگر کسی شخص میں غصہ کا جذبہ موجود نہ ہو تو اس کے تمام انفرادی اور اجتماعی حقوق کو پامال کردیا جائے گا۔ پھر وہ خطروں کو اپنے سے دور نہیں کرسکے گا لیکن اگر یہی جذبۂ غیظ وغضب مناسب حدود سے آگے بڑھ جائے، انسان معمولی معمولی باتوں کی وجہ سے آگ بگولا ہونے لگے تو اس کا نتیجہ معاشرے کی تباہی اور بربادی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہی حال انسان کے دوسرے فطری رجحانات اور میلانات کا ہے۔ اگر انھیں اعتدالی نقطہ پر نہ لائے جائے، ہر شخص پاگلوں کی طرح اپنے سرکش جذبات کو سیراب کرنے کی کوشش کرے تو اس کا انجام یہی ہے کہ تمدنی زندگی کا محل مسمار، ہر طرف فتنہ اور ہنگامہ کا بازار گرم ہوجائے، ظلم اور ناانصافی کے سوا کچھ نظر نہ آئے اور کمزوروں کے لیے زمین تنگ ہوجائے، ان

کے حقوق روند ڈالے جائیں اور نوع انسان کے درمیان طبقاتی اختلافات کا فاصلہ برابر بڑھتا جائے۔

کوئی شبہ نہیں کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کے فطری میلانات سو فیصدی عملی جامہ پہنیں۔ اس کی کوئی آرزو تشنۂ تکمیل نہ رہے۔ انّا دکّا لوگ ملیں گے جن کے فطری میلانات خود بخود نقطۂ اعتدال پر ہوں۔ جو دوسروں کے منافع سے اپنے منافع کے ٹکراؤ کے موقع پر میانہ روی اور توازن کے خواستگار ہوں۔

اب یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ان سرکش، معمر دفطری رجحانات اور جذبات کیوں کر قابو پایا جاسکتا ہے؟ انھیں نقطۂ اعتدال پر لانے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ معاشرے کے تمام افراد ایک قادر وتوانا، ہر حیثیت سے زبردست ہستی کے سامنے اپنے کو جوابدہ سمجھیں۔ وہ یقین رکھیں کہ وہ ذات ہر وقت تنہائی اور لوگوں کے مجمع میں ان کے تمام اعمال کی نگراں ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہو کہ جن اشخاص کے میلانات اور جذبات نقطۂ اعتدال پر نہیں ہوں گے انھیں سخت ترین سزاؤں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ لوگوں کے دل ودماغ میں ذمہ داری کے احساس کی صرف یہی صورت ہے کہ وہ ایک دانا اور توانا، حاضر وناظر، علیم وخبیر خدا پر ایمان لائیں۔ انہیں ایسے اشخاص دکھائی دیتے ہیں جو فقیر محتاج، تنگدست ہونے کے باوجود دوسروں کے اموال کی طرف ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ جنسی جذبات کے پورے طور سے مشتعل ہونے کے باوجود پاک دامنی کا راستہ نہیں چھوڑتے، کسی مادّی منصب، کسی دنیوی عہدے کے حاصل کرنے کی خاطر کوئی ناجائز ذریعہ نہیں اختیار کرتے۔ وہ اپنے فطری جذبات ومیلانات کو سیراب کرتے ہیں لیکن اعتدال وتوازن کے پابند رہتے ہیں۔ اس پارسائی، اس میانہ روی، اس اعتدال پسندی کا سرچشمہ صرف خدا، روز آخرت اور وہاں کی جزا اور سزا پر ایمان کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی فضائل اور بلند انسانی صفات ہمارے خمیر میں داخل ہیں۔ اچھائیوں کی طرف میلان، برائیوں سے دوری انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ کوئی عقلمند آدمی امانت کو بُرا اور بددیانتی کو اچھا نہیں سمجھ سکتا۔ آپ کو کوئی شخص نہیں مل سکتا جس کے نزدیک وعدہ وفائی بُری اور وعدہ خلافی اچھی صفت ہو۔ راست گوئی قلم آفرینش نے ہر ایک کے صفحۂ فطرت پر لکھ دی ہے، بچہ راست گوئی کا پابند ہے۔ یونہی عفت اور پاک دامنی فطرت بشری کی پکار ہے۔ اسی لیے ناپاک اشخاص بھی شروع شروع اپنے کو پاکدامن اور پارسا ظاہر کرتے ہیں۔ چور اور ڈاکو جب چوری کا مال آپس میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو ایک دوسرے کو عدل وانصاف کی پابندی کے بارے میں نصیحت کرتے ہیں۔

انسان کی ذات میں بہت سے اخلاقی فضائل سے متصف ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ ان کے بارآور ہونے کے کچھ اسباب وشرائط ہیں۔ مذہب جزا اور سزا کے تصور کے ذریعے بلند انسانی صفات کی مکمل پرورش کرسکتا ہے۔ مذہب کے پیش کیے ہوئے دستورالعمل میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ان صفات کو پروان چڑھائے۔ اس نے انسان کو بتایا ہے کہ اگر تم اچھے صفات اختیار کروگے تو تمھیں اس کا انعام ملے گا۔ اس کے برخلاف بُرے صفات اختیار کرنے کی شکل میں تمھیں انتہائی تکلیف دہ سزائیں بھگتنا پڑیں گی۔ ہم اس کے منکر ہیں کہ بعض علماء اخلاق کی ہدایات بلند انسانی صفات کی پرورش میں بے اثر ہیں کیوں کہ اس بارے میں ان کی راہ نمائی کے معنی ہیں صرف کوئی پرزور تقریر۔ کوئی دل پذیر تحریر۔ ان کی ہدایات کے عملی جامہ پہننے کا کوئی سامان موجود نہیں ہے۔

مذہب نے ایک طرف اخلاقی فضائل سے افراد انسانی کو متصف بنانے کے لیے انتہائی جامع اور مؤثر راہ نمائی کی، دوسری طرف اپنے ہدایات پر عمل کرانے کے لیے آخرت کا تصور پیش کیا۔ یہ بتایا کہ وہاں انسان کو ہر بات کا عوض ملے گا۔ انصاف پسند عقلاء عالم کا اتفاق ہے کہ مذہب اخلاق کی پناہ گاہ ہے بغیر مذہب کے اخلاق کی نشو ونما کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اخلاقی فضائل مثلاً پاکدامنی، امانت داری، راستی ودرستی، فداکاری، یتیم، بیواؤں اور حاجت مندوں کی خبر گیری اکثر اوقات بہت سی مادّی محرومیوں اور دنیوی گھاٹوں کا سبب ہے۔

ایک عفیف مرد اور عورت کو بہت سی لذتیں چھوڑنی پڑیں گی۔ سچ بولنے کی وجہ سے انسان کو کبھی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں کوئی معقول سبب نہیں انسان اخلاقی فضائل کی پابندی کرکے خسارے میں رہے، لیکن اگر اس کا عقل ہو کہ یہ وقتی اور دنیوی محرومیاں بلاعوض اور بلاصلہ نہیں ہیں۔ یہاں میں محروم رہوں لیکن ایک وقت آئے گا جب مجھے ان اخلاقی فضائل کی پابندی کی جزا ملے گی۔ اگر انسان کو یہ یقین ہو کہ اخلاقی پستیاں چاہے دنیا میں میرے لیے طرح طرح کی لذتیں فراہم کردیں لیکن آخرت میں مجھے ان کی وجہ سے سخت ترین سزائیں بھگتنا ہوں گی تو اس کی عقل اس سے مطالبہ کرے گی، جذبۂ حبّ ذات محرک بنے گا کہ انسان اخلاقی فضائل سے متصف ہو اور اخلاقی پستیوں سے کنارہ کشی اختیار کرے۔

وہ زندگی جس میں خدائے حاضر وناظر کا تصور نہ ہو، وہ زندگی جس میں آخرت اور وہاں کی جزا

وسزا کا عقیدہ نہ ہو انسان کے لیے ایک خالص مادّی ماحول تیار کرتی ہے جس میں ہر طرح کے انسانی اخلاق واوصاف مرجاتے ہیں۔ ایسے ماحول میں انسان کے تمام افعال واعمال کا محور اس کے دنیوی فوائد اور اغراض ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسان کسی یتیم کی خبر گیری کرے، کسی بیوہ کا سرپرست بنے، ہاں ایسے مادّی خودغرض ماحول میں انسان کمزوروں اور ناداروں کی خبیر گیری اس وقت کیا کرتا ہے جب اسے خوف ہو کہ ایسا نہ کرنے کی شکل میں وہ بغاوت کردیں گے، وہ ہماری اینٹ سے اینٹ بجادیں گے، ان کی زبان بندی کے لیے انھیں مست اور بے ہوش بنانے کی غرض سے ضرورت ہے کہ کچھ ان کی اشک شوئی کی جائے۔ کسی حدتک انھیں محرومی کے اندھیرے کنویں سے نکالا جائے۔

مادّی ذہنیت کے اشخاص کے بالکل برخلاف وہ لوگ جو خدا کو مانتے، اس کے علم واطلاع کے قائل اور وہاں کی جزاوسزا کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ بغیر کسی مادّی محرک کے بے لوثی کے ساتھ یتیموں، بیواؤں محتاجوں کی دست گیری کے لیے کمربستہ رہتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ ان کو آخرت میں ان کے اعمال کی کئی گناہ زیادہ جزا ملے گی۔

جب کوئی شخص خدا کو نہ مانتا ہو، آخرت کا قائل نہ ہو، وہاں کی جزاوسزا کا عقیدہ نہ رکھتا ہو۔ جب اسے یہ یقین ہو کہ میرے اعمال کا مجھے کوئی مادی عوض ملنے والا نہیں ہے تو وہ کیوں اور کس لیے اپنے مصالح کے خلاف، اپنے رشتہ داروں سے مصالح کے خلاف صرف عدالت وانصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی اقدام کرے۔

۵۔ اطمینانِ نفس کا سرمایہ

اس کا اقرار کرنا انصاف کے خلاف ہے کہ انسان نے اپنے وسیع علوم وفنون کی بدولت بہت سی مشکلات زندگی پر قابو پالیا ہے۔ وہ ماقبل کے زمانے کی طرح بالکل کمزور اور بے چارہ نہیں رہا ہے۔ ایک وقت وہ اپنے زبردست دشمن جراثیم سے ناواقف تھا اس لیے اسے ان سے مقابلے کا طریقہ بھی معلوم نہ تھا۔ جراثیم کے انکشاف اور ان کو نیست ونابود کرنے کے طریقے سے واقفیت کے بعد سے لاعلاج بیماریوں سے نجات مل گئی ہے۔ وہ پہلے کب جانتا تھا کہ دولت وثروت کے اصلی خزانے زمین کے سینے میں چھپے ہوئے ہیں۔ جب مختلف چیزوں کے معدن کے چہرے سے علم وتحقیق کے طاقتور ہاتھوں نے نقاب ہٹائی تو موقع ملا کہ وہ نوعِ انسانی کے آرام وراحت کے لیے طرح طرح کے

وسائل اور ذرائع ایجاد کرے۔

کون اس واقعیت پر پردہ ڈال سکتا ہے کہ صنعت کے میدان میں انسان اتنا آگے بڑھا، اتنا آگے بڑھا کہ اب اس کے ہاتھوں نے فضاؤں کے دروازے اس کے سامنے کھول دیئے ہیں۔ اس نے چاند میں آدمی بھیج کر بلا لیا ہے۔ طبابت کے فن میں اس نے اتنی ترقی کی کہ وہ اب قدرتی دل اور گردے کا کام مصنوعی دل اور گردے سے لینے لگا ہے۔

ایک طرف یہ غیر معمولی حیرت انگیز، قابل فخر علمی اور فنی کامیابیاں ہیں۔ دوسری طرف ہماری آنکھوں کے سامنے یہ حقیقت ہے کہ ان تمام مادی ترقیوں کے باوجود انسان کا دل مطمئن نہیں ہے، اس کا نفس سکون کی نعمت سے محروم ہے۔ نہ جانے اس کی کیا وجہ ہے کہ انسان جتنا صنعت کے میدان میں آگے بڑھ رہا ہے، مادّی علوم میں ترقی کر رہا ہے، جتنی جسمانی راحت وآسائش میں فراوانی پیدا ہو رہی ہے، اتنی نفسیاتی مشکلات بڑھ رہی ہیں، ذہنی اور دماغی الجھنوں میں اضافہ ہو رہا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مادّی ترقی اور نفسیاتی اضطراب ایک دوسرے کے ہمراہ ہیں، یہ لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، ان دونوں کے درمیان جدائی نہیں ہوسکتی۔

یہ صحیح ہے کہ انسان ہر زمانے میں کسی نہ کسی حد تک اضطراب، تشویش اور پریشانی کا شکار رہا ہے لیکن کسی زمانے میں موجودہ دور کی طرح وہ خوف وہراس اور دماغی الجھنوں سے دوچار نہیں دکھائی دیتا۔ اس حقیقت کا اعلان دنیا کے اخبار اور مطبوعات چیخ چیخ کر بڑی شدت سے کر رہے ہیں۔

امریکہ جو اس وقت دنیا کا سب سے بڑا صنعتی مرکز ہے وہاں کے جوانوں میں سے آدھے کم از کم ایک مرتبہ ضرور اضطراب واختلاج کے علاج کے واسطے ڈاکٹروں کے پاس جاتے ہیں۔ وہاں کے ڈاکٹر کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کے ہر آٹھ آدمیوں میں سے ایک شخص اپنی عمر کا ایک حصہ ایسے اسپتالوں میں بسر کرتا ہے جہاں نفسیاتی بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر امریکہ کسی جگہ اپنی فوج بھیجنے سے پہلے سپاہیوں کا طبی معائنہ کراتا تھا۔ اس معائنہ کے بعد پتا چلتا تھا کہ ہر چھے سپاہیوں میں سے ایک سپاہی دماغی اور نفسیاتی کمزوریوں میں مبتلا ہے اس کی وجہ سے اس کو فوجی خدمت سے معاف کر دیا جاتا تھا۔ اگر امریکہ اور تمام دوسرے صنعتی ممالک اس سلسلے میں ہر سال اعداد وشمار شائع کرتے رہیں تو یہ حقیقت لوگوں کے سامنے آئے جائے کہ موجودہ زمانہ اور اضطراب، دور

تشویش دور جنون ہے۔ گویا یہ دماغی پریشانی، ذہنی کوفت، قلبی اضطراب واختلاج، نفسیاتی الجھن اس صنعتی تہذیب وتمدن کا ناخوشگوار کفارہ ہے جو انسانیت ادا کر رہی ہے۔

بے چینی کے اسباب اور ان کا حل

(الف) انسان کی فطرت میں چھان بین کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ اس بنا پر اس کی دلی آرزو ہے کہ وہ معمائے وجود کو حل کرے۔ وہ ہمیشہ یہ سمجھنے کا خواہش مند ہے کہ اس عالم ہستی کا آغاز اور انجام کیا ہے؟ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا؟ اس کی خلقت کا راز کیا ہے؟ کچھ لوگوں کے پاس چونکہ کافی مقدار میں علمی سرمایہ موجود ہے چونکہ ان کی صحیح راہنمائی کی گئی ہے لہٰذا انھیں راز خلقت معلوم ہو گیا ہے۔ انھیں یہ پتا چل گیا ہے کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جائیں گے۔ ان کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ماحول کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے حیرت اور سرگردانی کے سمندر میں غوطے لگا رہے ہیں۔ ان میں جذبۂ تجسس موجود ہے۔ وہ رازِ خلقت سمجھنا چاہتے ہیں لیکن صحیح راہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے وہ کسی قطعی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کا دماغ پریشانی اور تشویش کا شکار ہو جاتا ہے۔ کبھی ان میں مالیخولیائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے چھٹکارے کے لیے کیا یہ عاقلانہ بات نہیں ہے کہ انسان راز وجود کے حل کرنے کی کوشش کرے، کائنات کے آغاز وانجام کی بابت غور وفکر سے کام لے اور کسی مثبت یا منفی نتیجے تک اپنے ذہن کو پہنچا کر یک سوئی حاصل کرے؟

(ب) کون انکار کر سکتا ہے کہ انسان کی حرص وطمع غیر محدود ہے۔ دوسری طرف اس کی قوت انتہائی محدود ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی تمام آرزوئیں پوری ہو جائیں۔ اس کے دل کی کوئی تمنا تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ انسان کی امیدوں کا دسواں حصہ بھی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔ اس دنیا طلبی اور محرومی کا نتیجہ کیا ہے؟ اضطراب، تشویش، ذہنی اطمینان کا فقدان۔ جس شخص کے دماغ کا ہر گوشہ دنیا طلبی اور مادّہ پرستی سے بھرا ہوا ہے جس کا مقصد زندگی ہے زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنا، زیادہ سے زیادہ جسمانی قوتوں سے لطف اندوز ہونا۔ وہ اگر سو فیصدی اپنے مادّی مقاصد کو پورا نہ کر سکے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے نفس کا اضطراب، دل کی بے چینی اور دماغ کی پریشانی۔

مذہب اپنے حیات بخش تعلیمات کے ذریعے انسان کے جذبات حرص وطمع میں اعتدال پیدا کر دیتا ہے۔ مذہب جاہ طلبی اور ثروت اندوزی کی کوششوں کو معتدل بناتا ہے۔ وہ انسان کو عزت نفس،

خودداری، نیکوکاری اور پرہیزگاری کی دعوت دیتا ہے۔اس نے اس بارے میں صرف واعظانہ ہدایات پر اکتفانہیں کیا بلکہ ناجائز اور نقصان رساں حرص وطمع کو گھٹانے کے لیے انسان کو آگاہ کیا ہے کہ اس دنیا کے علاوہ ایک دوسرا عالم ہے جہاں اسے اس کی غلط کاریوں کی سخت ترین سزائیں دی جائیں گی۔ مذہب نے تصور آخرت پیدا کر کے انسان کے رُخ کو دنیا کی طرف سے کسی حد تک ہٹایا ہے۔اس کی جاہ طلبی اور دنیا پرستی کی آرزو میں توازن پیدا کیا ہے۔ مذہب نے انسان کو ہدایت کی کہ جب دنیا کی زندگی چندروزہ ہے تو اسے مقصد اعلیٰ قرار دینا بیوقوفی ہے۔اس کی پوری کوشش رہنا چاہیے کہ وہ آخرت کو بنائے اور سنوارے۔

(ج) کس کے پیشِ نظر نہیں ہے کہ یہ دنیا مصائب وشدائد کی آماجگاہ ہے۔ ہر شخص اپنی زندگی کے دوران میں طرح طرح کے مصائب میں گرفتار ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنی محرومیاں اور شکستیں اسے برداشت کرنا پڑتی ہے۔اس کے عزیز اس سے جدا ہوتے ہیں۔ نہ جانے کتنے آفاتِ ارضی وسماوی سے وہ مقابلہ کرتا ہے۔حقیقتاً یہ دنیا رنج وغم، طوفان، سیلاب، زلزلے، قحط سالی، بے ثباتی، بے رحمی اور بے مروّتی کا ٹھکانہ ہے۔ یہ دنیا نادان خوش قسمتوں اور دانا بدبختوں کی آبادی ہے۔ان میں سے ہر چیز انسان کو پریشان اور بے چین کرنے کے لیے کافی ہے۔اس طوفانی دنیا میں جہاں زندگی کی کشتی سمندر میں چھپے ہوئے پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتی ہے، کوئی ایسی چیز ہونا ضروری ہے جو انسان کے دل اور دماغ کو سکون عطا کرے۔ یہی قلبی سکون اس ٹوٹی ہوئی کشتی کو ساحل نجات تک پہنچا سکتا ہے۔

مذہب راہنمائی کرتا ہے کہ انسان اس مصائب سے بھری دنیا میں تنہا نہیں ہے۔ رحیم وکریم، قادر وتوانا خالق اس کا پشت پناہ ہے۔اس خالق کے بارے میں یہ عقیدہ کہ وہ انسان سے زیادہ اس کے فائدے اور نقصان سے باخبر ہے، مصائب وشدائد کے ناخوشگوار اثرات کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیتا۔ کیوں کہ انسان یقین رکھتا ہے کہ جن حالات سے بھی دوچار ہے وہ اس حکیم وعلیم، قادر وتوانا خدا کا فیصلہ ہیں۔اس کے تمام کام مخصوص مصالح پر مبنی ہیں۔ مذہب انسان سے کہتا ہے کہ مصائب کے موقع پر صبر سے کام لینا چاہیے۔ یہ آخرت کے اجر وثواب ملنے کا سبب ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

مصائب وآلام میں گرفتاری کو فیصلۂ الٰہی سمجھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر قسم کی سختیوں کو انسان

برداشت کرتا رہے چاہے وہ غلط اور فاسد معاشرے کی پیدا کی ہوئی ہوں۔ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور صاحبانِ زر دوزر اس پر ہر طرح کے ظلم کرتے رہیں۔ مذہب ان مصائب و شدائد کو فیصلہ الٰہی کا نتیجہ قرار دیتا ہے جو انسان کی کاگزاری بلکہ اس کے تصور و تخیل سے بالاتر ہوں۔ ایسی مصیبتوں کے مقابلے میں مذہب انسان کو صبر و تحمل کی ہدایت کرتا ہے۔ ایسے مصائب و الام ہیں جن کا تعلق تقدیر خداوندی سے ہے، ان کے سامنے سر جھکانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ لیکن جن مصیبتوں اور سختیوں کا سبب معاشرے کا غلط اور فاسد نظام ہے ان کا تقدیر الٰہی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایسے معاشرے کو سدھارنے کی کوشش کریں۔ ظالموں کو ظلم کرنے کا موقع نہ دیں۔ ایسا طبقاتی اختلاف نہ پیدا ہونے دیں کہ کچھ لوگوں کے جسموں پر انتہائی قیمتی کپڑے ہوں اور کچھ لوگ چیتھڑے لگائے رہیں۔ ایک گروہ کے دسترخوان پر کئی کئی قسم کی مرغّن غذائیں ہوں اور دوسرے نان شبینہ کو محتاج ہوں۔ کچھ اشخاص مختلف موسموں کی مناسبت سے مختلف عالی شان محلوں میں زندگی بسر کریں اور کچھ اشخاص کے پاس ان کی ضرورت کے مطابق سر چھپانے کے لیے معمولی سا مکان بھی نہ ہو۔ فاسد نظام معاشرہ کے لائے ہوئے مصائب کے اوپر صبر کرنے کی ہرگز ہدایت نہیں کرتا ہے۔ بے شک آفات ارضی و سماوی میں مبتلا ہونے کے موقع پر مذہبی عقائد انسان کے لیے تشفی اور تسلی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ یہ سامان ان لوگوں کے لیے موجود نہیں ہے جو خدا کے وجود اور اس کی تقدیر کے قائل نہیں ہیں، جو یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ اس دنیا کے علاوہ ایک دوسرا عالم ہے جہاں دنیا کی محرومیوں اور مصیبتوں کا عوض ملے گا۔

ہر شخص کو یقین ہے کہ اسے ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔ اس نے اس دنیا میں جو دولت اکٹھا کی ہے جو بڑے بڑے مکان بنائے ہیں جو عظیم الشان جائیداد فراہم کی ہے۔ اپنے ملک و قوم کے درمیان جو غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل کیا ہے وہ سب رہ جائے گا اور انسان چلا جائے گا۔ موت کا تصور عام طور سے ہر ایک کے لیے انتہائی ناخوشگوار ہے خصوصیت سے ان لوگوں کے واسطے جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان کی کتاب زندگی بند ہو جاتی ہے، جن کا عقیدہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ یہی دنیا ہے، اسے چھوڑنے کے بعد کوئی دوسرا عالم نہیں ہے جہاں انسان کو منتقل ہونا اور زندگی بسر کرنا ہو۔ ایسے لوگوں کی زندگی کا آخری دور بڑی مایوسی، پژمردگی و تنگی کے ساتھ گزرتا ہے۔ اس دور میں کبھی انسان کے دل و دماغ پر ایسا نفسیاتی دباؤ پڑتا ہے کہ اس کی کارگزاری کی قوت جواب دے دیتی ہے۔ وہ ایک مفلوج اور

اپاہج شخص کے مانند ہوجاتا ہے۔ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو انتہائی عیش وآرام اور بےفکری میں زندگی بسر کررہا ہے جب یہ اعتقاد رکھے گا کہ موت فنا کا دروازہ ہے، موت کے بعد تاریکی ہی تاریکی، سنّاٹا ہی سنّاٹا ہے تو اپنے کو آستانۂ فنا پر دیکھ کر عجیب وغریب مایوسی اور ناامیدی کا شکار بن جائے گا۔اس کی بقیہ زندگی انتہائی تلخ اور ناخوشگوار ہوجائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ جس ماحول پر خالص مادّیت چھائی ہوئی ہے۔ جہاں کے لوگوں کا مقصد زندگی صرف دنیا طلبی، مادہ پرستی اور لذت اندوزی ہے، جن کی آرزوئیں غیر محدود اور امکانات محدود ہیں، جو دنیا کو آفات ارضی وسماوی سے بھرا ہوا دیکھتے، اپنے کو طرح طرح کی محرومیوں کا شکار پاتے، موت کو فنا کا دروازہ سمجھتے ہیں، وہ ہمیشہ بےچین، رنجیدہ، پژمردہ اور مایوس نظر آتے ہیں۔خصوصیت سے آخر عمر میں ان کیفیات کا دباؤ نمایاں طور سے بڑھ جاتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مادہ پرست اور مذہبی عقائد سے محروم انسان زبان سے نہ کہے لیکن وہ ایک پناہ گاہ کی تلاش میں ہے جو اس کی مضطرب روح کو اطمینان عطا کرے۔ یہ مادّہ پرست انسان کبھی نشہ آور چیزوں کے دامن میں پناہ لیتا ہے، کبھی اپنے کو جوے کی گود میں ڈال دیتا ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کے عقل واحساس کی قوتیں تباہ ہوجاتی ہیں تو ہوں، پرواہ نہیں ہے۔لیکن کم ازکم کچھ دیر کے لیے عالم بےخبری میں چلا جائے۔ وہ اپنے کو بھول جائے۔اس کے دل ودماغ کے اوپر جو ناقابل برداشت بوجھ پڑ رہا ہے اس سے چھٹکارا مل جائے۔

مذہب نے انسان کے دماغ میں معاد کا تصور پیدا کرکے بتایا کہ انسان کا رشتۂ زندگی کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔موت میں یہ دم نہیں ہے کہ اسے شکستہ کرسکے۔ موت ابدیت کا دروازہ ہے۔ عزرائیل جو قبض روح پر مامور ہیں حقیقتاً ہماری زندگی کے امانت دار ہیں۔ یہ دنیوی زندگی ابدی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔معاد کے عقیدے نے انسان کی اس دنیوی مادی زندگی میں چہل پہل پیدا کردی ہے۔ مذہب نے انسان کے چہرے سے پژمردگی چھین کر اسے بارونق بنادیا۔ مایوسیوں کے بادل چھٹ گئے۔امیدوں کی تجلیاں چمکنے لگیں۔خصوصیت سے مذہب نے بوڑھے اشخاص کے دل ودماغ کے غیر معمولی بوجھ کو اٹھا کر ان کا دل ہلکا کردیا۔آخرت کی زندگی اور وہاں کی نعمتوں کی خوش خبری دے کر ان کے چہرے سے رنج وغم کی جمی ہوئی گرد کو دور کردیا۔

فرمایئے وہ مذہبی عقائد جو معمائے وجود کو حل کردیں، شک اور تردد سے ذہنِ انسانی کو نجات

دے دیں۔

وہ مذہبی عقائد جو اپنے اخلاقی تعلیمات کے ذریعے انسان کے جذبۂ حرص وہوس میں اعتدال پیدا کردیں۔

وہ مذہبی عقائد جو آخرت کی سخت ترین سزاؤں کے وسیلے سے جذبۂ حرص وطمع کو کمزوروں کے حقوق پامال کرنے سے روک دیں۔

وہ مذہبی عقائد جو انسان کی نگاہ میں دنیا کی چندروزہ مادّی زندگی کو اس کا مقصود اصلی نہ بننے دیں۔

وہ مذہبی عقائد جو انسان کے دماغ میں خدائے علیم وحکیم کی قضا وقدر کا خیال راسخ کرکے آفات ارضی وسماوی کے ناخوشگوار اثرات سے اسے محفوظ رکھیں۔

وہ مذہبی عقائد جو انسان کو ابدی زندگی کا مالک بنا کر اندیشۂ فنا کی وحشت ناک مایوسی سے بچالیں۔ کیا اس قابل نہیں ہیں کہ انسان ان کے متعلق غور وخوض کرے؟

صرف مذہب سکون واطمینان عطا کرتا ہے۔ مذہب سے روگرداں ہوکر انسان کے لیے اضطراب ہی اضطراب، پریشانی ہی پریشانی ہے۔

الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَلَمْ يَلْبِسُواْ إِيْمَانَهُم بِظُلْمٍ أُوْلَئِكَ لَهُمُ الأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُون. ''سکون واطمینان صرف ایمان والوں کے لیے ہے۔ ان اہلِ ایمان کے واسطے جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے کپڑے نہیں پہنائے ہیں۔'' (قرآن، انعام:۸۲)

هُوَ الَّذِیْ أَنزَلَ السَّكِيْنَةَ فِیْ قُلُوبِ الْمُؤْمِنِيْنَ. ''وہ خدا وہ ہے جس نے سکون کا سرمایہ صرف مومنین کے دلوں پر نازل کیا ہے۔'' (قرآن، فتح:۴)

أَلاَ بِذِكْرِ اللّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوب. ''اے افرادانسانی! تمھیں آگاہ ہونا چاہیے کہ یادِ خدا سے دل اور دماغ مطمئن ہوتے ہیں۔'' (قرآن، رعد:۲۸)

أَلا إِنَّ أَوْلِيَاء اللّهِ لاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُون. ''تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ فقط خدا کے دوستوں کے لیے خوف اور رنج نہیں ہے۔ (قرآن، یونس:۶۲)

(ماخوذ: اسلام اور عصرِ جدید، جلد:۹، شمارہ:۳، جولائی ۱۹۷۷ء)

رضی احمد کمال *

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا شمار ہندوستان کے ان صوفیائے کرام میں ہوتا ہے جن کے شخصی اور روحانی اثرات اور تعلیمی وتبلیغی خدمات کا بیشتر تذکرہ نگاروں نے اعتراف کیا ہے، ان کے اجداد میں شیخ نظام الدین پہلے بزرگ ہیں جو ساتویں صدی ہجری مطابق تیرہویں صدی عیسوی میں اپنے صاحبزادے شیخ نصیرالدین کے ہمراہ دہلی آئے، یہ علاؤالدین خلجی کا دور رحکومت تھا۔[1] صاحب نزہت الخواطر لکھتے ہیں: ''قاضی نظام الدین اپنے والد کی رحلت کے بعد ہندوستان آئے۔''[2] اسی زمانے میں ایک اور بزرگ قاضی شہاب الدین جو شیخ نظام الدین کے عزیز تھے غزنی سے دولت آباد ہوتے ہوئے دہلی تشریف لائے، یہاں قاضی عبدالمقتدر اور مولانا خواجگی دہلویؒ سے علوم ظاہری اور فیوض باطنی کے اکتساب کے بعد قاضی شہاب الدین جون پور تشریف لے گئے، اس وقت وہاں سلطان ابراہیم شرقی کی حکومت قائم تھی، جو علم وفضل کا قدردان اور علماء کی بیحد تعظیم کرنے والا تھا، چنانچہ اس نے قاضی شہاب الدین کے جون پور پہنچنے پر ان کی بہت قدر افزائی کی اور صدرالعلماء کے خطاب سے نوازا، جون پور میں یہ قاضی شہاب الدین کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔

---

* سابق پروفیسر وسابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے:

''واز جملہ فضلائے عصر قاضی شہاب الدین جون پوری ست، اصل او از غزنین ست، در دولت آباد دکن نشو ونما یافت، سلطان ابراہیم در تعظیم وتوقیر او بسیار کوشید و در روز ہائے در مجلس او بر کرسئ نقرہ می نشست۔'' [۳۳]

(ترجمہ: اور اسوقت کے تمام فضلاء اور علماء میں ایک شخصیت قاضی شہاب الدین جون پوری کی ہے جو اصلاً غزنین کے رہنے والے ہیں اور بعد میں دولت آباد دکن میں پرورش پائی، شرقی بادشاہ سلطان ابراہیم نے ان کی بہت زیادہ تعظیم وتکریم کی اور دربار میں مجلس کے اوقات میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی چاندی کی کرسی پر بیٹھا کرتے تھے۔)

اسی زمانے میں شیخ نظام الدین بھی قاضی شہاب الدین کی قرابت قریبہ کی وجہ سے دہلی سے جون پور آکر آباد ہو گئے، یہاں قاضی شہاب الدین نے اپنی صاحبزادی کی شادی شیخ نظام الدین کے صاحبزادہ نصیرالدین سے کردی، جن سے تین بیٹے، صفی الدین، فخر الدین اور رضی الدین پیدا ہوئے، جون پور میں کچھ عرصے قیام کے بعد نصیرالدین اپنے اہل وعیال کے ساتھ ردولی منتقل ہو گئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار فرمائی۔

شیخ نصیرالدین کے تینوں صاحبزادے صاحب قدر عالم اور اساتذہ وقت ہوئے ہیں، شیخ صفی الدین کے علم وفضل، زہد وتقوی اور خدا ترسی کے بارے میں ان کے تمام تذکرہ نگار اتفاق رائے رکھتے ہیں، صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

''شیخ صفی الدین، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نواسے اپنے ذہن کی رسائی کی وجہ سے نوادر زمانہ میں سے تھے۔'' [۳۴] راہِ طریقت میں شیخ صفی الدین، شیخ اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے فیض یافتہ تھے، شیخ اشرف جہانگیر سمنانیؒ ان کی علمی خصوصیات کو سراہتے ہوئے فرماتے ہیں:

''شیخ صفی تو علوم وفنون کے لحاظ سے تمام ہندوستان کے عجائبات میں سے تھے۔'' [۳۵] شیخ صفی الدین کے خصائص بیان کرتے ہوئے عبدالرحمٰن چشتی

تحریر فرماتے ہیں: ''حضرت مخدوم شیخ صفی الدین قدس سرۃ العزیز اگر چہ ازفرزندانِ امام ہمام حضرت امام اعظم است اما با عتبار علم وفضل، زہدو تقوی، کمالات معنوی، ثانی ابوحنیفہ است۔''[۵] (ترجمہ: حضرت مخدوم شیخ صفی الدین قدس سرۃ العزیز اگر چہ حضرت امام اعظم جیسے اہم امام کے صاحبزادوں میں سے ہیں لیکن علم وفضل، زہدوتقویٰ اور معنوی کمالات میں دوسرے ابوحنیفہ ہیں)

شیخ صفی الدین نے سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں شیخ اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے حصول خلافت کے بعد بنگال، جون پور اور اودھ کے مختلف علاقوں میں ایک عرصے تک سیر وسیاحت کرنے کے بعد وطن مراجعت فرمائی اور یہاں واپسی پر عہدہ قضا پر فائز ہوئے، اس کے بعد شیخ صفی الدین کی شادی صفیہ بی بی سے ہوئی جو ردولی کے ایک معزز گھرانے کی دختر نیک اختر تھیں۔

۱۲/ربیع الاول ۷۸۹ھ مطابق ۱۳۷۷ء کو شیخ صفی الدین کے یہاں شیخ اسماعیل پیدا ہوئے، جو شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے والد ماجد ہیں۔

شیخ محمد اسماعیل نے اپنے والد ہی سے تعلیم وتربیت حاصل کی، علوم ظاہری وباطنی سے فراغت کے بعد قاضی اسماعیل کی شادی قاضی دانیال کی ہمشیرہ مریم سے ہوئی، قاضی صاحب کا خاندان اپنی شرافت اور زہدوتقوی کی وجہ سے ردولی میں ممتاز تھا، قاضی اسماعیل کے چار فرزند ہوئے، عبدالصمد، عزیز اللہ، عبدالقدوس اور حبیب اللہ۔ شیخ صفی الدین نے ۱۳/ذیقعدہ ۸۱۹ھ مطابق ۱۴۱۶ء کو وفات پائی، والد کی وفات کے بعد، شیخ اسماعیل مسند ارشاد وتلقین پر بطور جانشین فائز ہوئے۔ شیخ اسماعیل کی زندگی کا بڑا حصہ درس وتدریس اور رشد ہدایت میں گذرا، شیخ اسماعیل کی وفات ۸۶۰ھ مطابق ۱۴۵۶ء کو ردولی میں ہوئی اور اپنے والد شیخ صفی الدین کے قریب دفن ہوئے۔

ولادت اور ابتدائی تعلیم وتربیت

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی ولادت ۸۵۲ھ مطابق ۱۴۵۰ء ردولی میں ہوئی، شیخ عبدالقدوس امام اعظم ابوحنیفہؒ کی چھبیسویں پشت میں شمار کئے جاتے ہیں۔

شیخ عبدالقدوس بن مولوی اسماعیل بن قاضی صفی الدین بن خواجہ نصیرالدین بن خواجہ نظام الدین بن خواجہ آدم بن خواجہ ظہیرالدین بن خواجہ احمد بن خواجہ عبدالواسع بن خواجہ عبدالقادر بن عبدالغنی بن عثمان بن اسحاق بن عمر بن فضل اللہ بن نصیرالدین بن سعدالدین بن نجم الدین بن داؤد بن جعفر بن حامد بن خیرالدین بن امام طاہر بن امام ابراہیم بن امام احمد بن امام اعظم ابی حنیفہؒ۔[۶] حضرت امام اعظمؒ کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے اپنے نام کے ساتھ حنفی نسبت کا استعمال کیا ہے، اگرچہ اس سلسلے میں یہ بھی خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ حنفی مسلک رکھنے کی وجہ سے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ اس نسبت کو استعمال کیا ہے، مگر صاحب مفتاح التواریخ کی عبارت اور شجرہ حسب ونسب سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی اولاد میں سے ہیں، صاحبِ مفتاح التواریخ نے لکھا ہے:

''از مشاہیر مشائخ ہنداست واز اولاد امام اعظم ابوحنیفہ کوفی ست۔''[۷]

(ترجمہ: ہندوستان کے مشہور مشائخ میں سے ہیں اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کوفی کی اولاد میں سے ہیں)

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے والد شیخ اسماعیل نے بچپن ہی سے اپنے فرزند کی تعلیم وتربیت کی طرف خصوصی توجہ فرمائی اور خطوط نویسی اور خوش نویسی کی تربیت شیخ عبدالقدوسؒ کو اپنے والد سے ہی حاصل ہوئی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کے مکاتیب اپنی دل آویزی کے لیے مشہور ہیں، زمانہ طالب علمی میں شیخ عبدالقدوس کے ذوق کا یہ عالم تھا کہ وہ دن رات تحصیل علم میں مصروف رہتے تھے، انھوں نے ابتداء سے ہی حصول علم اور عبادت وریاضت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا، شیخ رکن الدین، ان کے ذوق علم اور شوق عبادت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں: ''چوں حضرت قطبی بہ تعلیم کتابہا مشغول شدند در تمام روزمی خواند وتمام شب بشغل ذکر وعبادت حق مشغول بودند۔''[۸] (ترجمہ: جب حضرت قطبی کتابوں کے مطالعہ اور تعلیم میں مشغول ہوئے تو سارا دن کتابیں پڑھتے رہتے اور ساری رات ذکر کے شغل میں اور اللہ تعالی کی عبادت میں مشغول رہتے تھے)

آپ ابتداء سے ہی نہایت ذہین اور نکتہ رس تھے اسی سبب اساتذہ بھی ان پر خاص توجہ اور شفقت فرماتے، دوران طالب علمی ہی میں ایک کتاب علم صرف میں تصنیف فرمائی تھی، شیخ عبدالقدوس

کی کتابی تعلیم صرف کافیہ[۹] ہی تک ہو پائی تھی کہ عشق الٰہی سے سرشار ہوکر ظاہری تعلیم کو ترک کر دیا اور خرقہ پوشی اختیار کر لی، اس صورت حال سے ان کی والدہ کو بہت تشویش ہوئی اور اپنے بھائی قاضی دانیال کو صورتِ حال سے آگاہ کیا، قاضی صاحب نے شیخ عبدالقدوس سے ترک تعلیم پر باز پرس فرمائی، ساتھ ہی تنبیہہ بھی کی، ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ کچھ عورتیں قریب سے گاتی ہوئی گذریں، گانے کی آواز سن کر شیخ عبدالقدوس پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی، قاضی صاحب نے اس کیفیت کو دیکھنے کے بعد بہن کو تسلی دی اور کہاں آپ فکر نہ کریں انشاءاللہ بہتر ہی ہوگا۔

شیخ عبدالقدوس نے اگرچہ چند ابتدائی کتابوں کے سوا تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر علوم ظاہری میں ان کو منجانب اللہ کمال حاصل تھا، شیخ رکن الدین فرماتے ہیں:

> ''اگرچہ میرے والد حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے اصول فقہ کی تعلیم بالکل حاصل نہیں کی تھی، لیکن آپ مجھے اصول فقہ میں اصول شاسی، [۱۰] حسامی اور اصول فقہ کی دوسری کتابوں کا درس دیتے تھے۔'' [۱۱]

بیعت وخلافت: شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ بظاہر شیخ محمد بن شیخ عارف بن شیخ احمد عبدالحق کے مرید وخلیفہ تھے لیکن شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ سے انھیں بے انتہا عقیدت وتعلق تھا، اسی تعلق کی وجہ سے ان کو شیخ احمد عبدالحق سے بھی فیض روحانی حاصل تھا، جس کا اظہار شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے خود انوار العیون میں تحریر کیا ہے:

> ''اجازت ایں فقیر با حضرت شیخ العالم در عالم معاملہ اول درست گشت، بعدہ با نبیرہ حضرت شیخ العالم شیخ الوقت حضرت شیخ محمد مدظلہٗ واعلی قدرہ بیعت کردیم، واز شرف اجازت مشرف گشتیم وحضرت شیخ العالم (شیخ احمد عبدالحق) ایں فقیر را در عالم معاملہ چند بار لطف کردند، ودست گرفتہ بہ زبان کرم فرمودند کہ ترا بہ خدا رسانیدم، الحمدللہ علی ذلک، چنداں معاملہ با حضرت شیخ العالم کہ در حد وغد نبایند... ایں معاملہ مارا در ظہور ولایت حضرت شیخ العالم بعد چہل سال از رحلت شیخ العالم بودہ است۔'' [۱۲]

(ترجمہ: اس فقیر کو اجازت جناب شیخ العالم کے ساتھ معاملے کے پہلے ہی

عالم میں حاصل ہوگئی تھی، اس کے بعد حضرت شیخ العالم کے پوتے شیخ الوقت حضرت شیخ محمد مدظلہ واعلی قدرہ (اللہ ان کی قدر و منزلت کو بڑھائے) ان سے بیعت کی اور اجازت کے شرف سے مشرف ہوا، اور حضرت شیخ العالم (شیخ احمد عبدالحق نے اس فقیر پر معاملے کے عالم میں کئی بار لطف فرمایا اور ہاتھ پکڑ کر اکرام والطاف کی زبان سے فرمایا کہ میں نے تمہیں خدا تک پہنچایا، الحمدللہ علی ذلک، اسی طرح سے یہ معاملات حضرت شیخ العالم کے ساتھ اتنی بار ہوئے کہ شمار وقطار میں نہیں آتے، یہ معاملات ہمیں حضرت شیخ العالم کی رحلت کے چالیس سال بعد ولایت کی شکل میں حاصل ہوئے) شیخ محمد سے اجازت وخلافت کے بعد شیخ عبدالقدوس نے خانقاہ شیخ احمد عبدالحق میں کافی وقت مجاہدے اور ریاضتوں میں گذارا، جہاں وہ اپنے ان مجاہدات کے علاوہ خانقاہ کی صفائی وہاں کے مہمانوں کی خدمت ان کے کھانا پکانے کے لیے جنگل سے لکڑیاں لانا جیسے کام ان کے معمولات میں شامل تھے، اس سخت محنت ومشقت کی وجہ سے ان کی صحت بھی متاثر ہوگئی تھی، بقول شیخ رکن الدینؒ مزاج میں بہت حدت پیدا ہوگئی تھی اور اس زمانے میں صرف ایک گدڑی زیب تن فرمایا کرتے تھے، ان کا کہنا ہے کہ میری پیدائش تک والد نے اس کے علاوہ کوئی دوسرا لباس اختیار نہیں کیا، ایک گدڑی جس میں بیسیوں پیوند لگے ہوئے تھے وہی ان کا لباس تھا، جس طرح روزہ نماز اور وظائف کو پابندی سے ادا کرتے اسی طرح روز ایک پیوند گدڑی میں پابندی سے لگاتے تھے۔

شیخ عبدالقدوسؒ کا زیادہ وقت عبادات ہی میں گذرتا تھا، فرض سنتوں اور مقررہ نوافل کے علاوہ روزمرہ کے اوراد و وظائف بہت پابندی سے پڑھتے تھے، نماز سے والہانہ عشق کی یہ کیفیت تھی کہ شدید سردی کے زمانے میں بھی ساری رات نوافل کھڑے ہوکر پڑھا کرتے تھے، شیخ رکن الدین فرماتے ہیں کہ شب برات میں ایک قرآن مجید سو رکعتوں میں باجماعت ختم ہونے کا شیخ کے یہاں معمول تھا۔

اس رات حافظ شیخ احمد، صاحبزادہ شیخ عبدالقدوس امامت فرمایا کرتے تھے، رمضان المبارک میں تین قرآن مجید سننے کا معمول ساری زندگی رہا، اپنے ذکر واذکار کے معمولات کے سلسلے میں شیخ عبدالقدوسؒ بیان فرماتے ہیں:

''میری عمر کے کئی سال اس طرح گذرے ہیں کہ میں عشاء کی نماز کے بعد سے ذکر بالجہر شروع کرتا تھا، یہاں تک کہ صبح ہو جاتی تھی۔'' [۱۳] ان عبادات وریاضات کے علاوہ شیخ عبدالقدس کا یہ معمول بھی تھا کہ وہ رمضان کے علاوہ بھی سال بھر کثرت سے روزے رکھا کرتے تھے۔ شیخ رکن الدین تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے چالیس سال میں آپ کو سوائے ایام ممنوعہ کے جو پانچ دن ہیں بغیر روزے کے نہیں دیکھا۔'' [۱۴]

قیام ردولی کے زمانے ہی میں شیخ عبدالقدس کی شادی، شیخ عارف کی صاحبزادی سے ہوگئی تھی۔ یہ خاتون بڑی عابدہ اور زاہدہ بی بی تھیں۔ والد اور دادا دونوں کی نسبت وتعلق کے تمام اثرات موصوفہ میں موجود تھے۔

شیخ عبدالقدوس كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلَالاً طَيِّبًا کے اصول کے مطابق ساری زندگی حلال روزی کے حصول پر ہی عمل کیا اور اسی بنا پر زراعت کا پیشہ اختیار کیا، جس سے اپنی اور گھر والوں کی ضروریات پوری فرماتے تھے۔

شیخ عبدالقدوس کے تذکرہ نگاروں نے ان کے ذریعہ معاش پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالی ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیاد کے یہاں صرف اتنا تذکرہ پایا جاتا ہے:

''وہ حلال روزی حاصل کرنے کے لیے زراعت کرتے تھے، جب ان کے کھیت میں غلہ تیار ہو جاتا ہے تو سب سے پہلے اسے درویشوں کو دیا کرتے تھے، بعدہ اپنی ضرورت بھر رکھ لیا کرتے تھے'' [۱۵]

شیخ عبدالقدوسؒ کو چاروں سلاسل طریقت میں اجازت حاصل تھی، سلسلہ چشتیہ صابریہ میں بظاہر انھیں شیخ محمد بن شیخ عارف سے اجازت حاصل تھی، لیکن فیض خاص کا تعلق شیخ احمد عبدالحق سے قائم

رہا جیسا کہ ایک مقام پر خود فرماتے ہیں: ''اگر چہ ارادت من بہ مخدوم شیخ محمد است، لیکن بیشتر اخذِ فیوض مرا از باطن جدِّ او شیخ احمد است قدس سرہما۔'' [۱۶]

(ترجمہ: اگر چہ میرے ارادت میرے مخدوم شیخ محمد سے ہے لیکن مجھے جو فیوض حاصل ہے وہ زیادہ تر ان کے دادا شیخ احمد قدس سرہما سے باطنی طور پر حاصل ہوئے ہیں)

سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں شیخ عبدالقدوس کو شیخ درویش بن قاسم اودھی سے اجازت حاصل تھی نیز اسی واسطے سے انھیں سلسلہ سہروردیہ، نقشبندیہ اور قادریہ میں بھی اجازت حاصل تھی۔ شاہ سید محمد حسین مراد آبادی نے شیخ عبدالقدوسؒ کے روحانی سلاسل کی تفصیل میں ''سلاسل اربعین'' کے نام سے ایک رسالہ تصنیف فرمایا ہے۔ حصول خلافت کے بعد شیخ عبدالقدوس نے ردولی ہی میں قیام کیا مگر جب ردولی کے حالات زیادہ خراب ہو گئے تو عمر خاں شیرانی حاکم شاہ آباد کے اصرار اور خواہش پر ۸۹۶ھ مطابق ۱۴۹۱ء میں مع اہل وعیال ردولی سے شاہ آباد منتقل ہو گئے۔

صاحب شرف المناقب نے اس واقعے کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے: ''درسن ستہ وتسعین وثمانیہ ہجری از ابتدائے سلطنت سلطان سکندر بن سلطان بہلول لودھی بموجب درخواست عمر خاں کاشی کہ اعظم امراء سلطان سکندر بود و بخدمت شیخ عبدالقدوس حنفی اعتقاد تمام داشت معہ فرزندان از ردولی انتقال نمودہ در قصبہ شاہ آباد کہ بہ نواح دہلی بود در آنجا سکونت نمود و شہرت بسیار یافت۔'' [۱۷]

(ترجمہ: ۸۹۶ء کے سال میں سلطان سکندر بن سلطان بہلول لودھی کی سلطنت کے ابتدائی زمانے میں عمر خاں کاشی کی درخواست کے مطابق جو کہ سلطان سکندر کے بڑے امراء میں سے تھا اور حضرت شیخ عبدالقدوس حنفی سے انتہائی عقیدت رکھتا تھا اپنے بیٹوں کے ساتھ ردولی سے منتقل ہو کر شاہ آباد کے قصبے میں جو کہ دہلی کے اطراف میں تھا چلے آئے اور وہاں سکونت اختیار کی اور بہت شہرت پائی۔ شاہ آباد میں تقریباً اڑتیس سال شیخ عبدالقدوس کا قیام رہا، شیخ حمید کے علاوہ باقی تمام صاحبزادگان کی ولادت

شاہ آباد میں ہی ہوئی، ۹۳۴ھ مطابق ۱۵۲۶ء اپنے ایک مرید ملک عثمان کی درخواست پر مع اہل وعیال شاہ آباد سے گنگوہ منتقل ہو گئے، اور پھر یہیں اپنی عمر کے آخری ایام تک قیام فرمایا، شاہ آباد سے گنگوہ کی آمد پر صاحب ''بحر ذخار'' تحریر فرماتے ہیں:

''سی و چند سال در اجرائے سلطنت سکندر بادشاہ آباد ماند و شہرت کمال یافت، دروقت بابر بادشاہ کہ شاہ آباد خراب شد بہ گنگوہ آمد و مسندِ فیض وارشاد را بیاراست۔''[۱۸]

(ترجمہ: تیس سال سے کچھ زیادہ سلطان سکندر کی سلطنت کے زمانے میں شاہ آباد میں رہے اور کمال کی شہرت پائی پھر بابر بادشاہ کے زمانے میں جب شاہ آباد تباہ ہو گیا تو گنگوہ آئے اور فیض وارشاد کی مسند کو زینت بخشی)

قیام گنگوہ[۱۹] کے دوران مغلوں کے حملوں کی وجہ سے ایسے حالات خراب ہوئے کہ بستیوں کی بستیاں اجڑ گئیں، خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنے گھروں سے بھاگ کر جائے پناہ تلاش کرتے تھے، انہی حالات میں شیخ عبدالقدوس بھی اپنے اہل وعیال کے ساتھ دریائے جمنا کے کنارے ''کتانہ'' نامی ایک گاؤں میں تشریف لے گئے، اسی زمانے میں دریائے جمنا کے مغربی کنارے پر ابراہیم لودھی کا لشکر بابر سے مقابلہ آرائی کے لیے خیمہ زن تھا، جس میں شیخ عبدالقدوس کے بہت سے معتقد و مرید بھی شامل تھے، ان لوگوں کو شیخ کے قیام کی اطلاع ہوئی تو معتقدین جوق در جوق ان سے ملاقات کے لیے آنے لگے، ابراہیم لودھی کو جب اس صورت حال کا علم ہوا تو وہ خود بھی شیخ عبدالقدوس کی خدمت میں پہنچا اور بہت اصرار و گذارش سے انھیں اپنے لشکر میں لے آیا، اس ملاقات میں شیخ عبدالقدوس نے ابراہیم لودھی سے فرمایا:

''مجھے اس مرتبہ خیریت معلوم نہیں ہوتی اور میں تمہیں پانی پت سے آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھتا۔''[۲۰] ابراہیم لودھی کے ساتھ خود تو لشکر میں چلے آئے مگر اپنے اہل وعیال کو شیخ رکن الدین کے ہمراہ گنگوہ روانہ کر دیا۔ بڑے صاحبزادے شیخ حمید اور سید راجہ مرید و خادم خاص شیخ عبدالقدوس کے

ساتھ ہی رہے۔

ابراہیم لودھی اور بابر کی فوجوں کے درمیان آغاز جنگ سے قبل ہی شیخ عبدالقدوس نے اس بات کا اشارہ فرمایا دیا تھا کہ مجھے اپنے گھوڑے کی رفتار سے یقین ہوتا ہے کہ ابراہیم کو یقیناً شکست ہوگی۔[۲۱]

ملاعبدالقادر بدایونی، بابراورابراہیم لودھی کی اس جنگ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۸/رجب ۹۳۲ھ مطابق ۱۵۲۵ء کو بابر اور ابراہیم لودھی کے درمیان جنگ شروع ہوئی، ابراہیم لودھی کوشکست کا منہ دیکھنا پڑا۔'' [۲۲]

بابر کی فوج نے حصول فتح کے بعد اور جنگی قیدیوں کے ہمراہ شیخ عبدالقدوس اور ان کے ساتھیوں کو بھی اپنی گرفت میں لے کر پانی پت سے دہلی تک پیدل چلنے کا حکم دیا، اگرچہ شیخ عبدالقدوسؒ کی صحت اس قابل نہ تھی، لیکن پھر بھی وہ پانی پت سے باہر کی فوج کے ہمراہ پیدل چل کر دہلی پہنچے۔ شیخ رکن الدین اس واقع کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''آپ پانی پت سے دہلی پیدل تشریف لائے لیکن بعد میں آپ کو رہائی مل گئی اور گنگوہ تشریف لے آئے۔'' [۲۳]

لودھیوں میں خاص طور پر سکندر لودھی سے شیخ عبدالقدوسؒ کو خاص تعلق تھا، اس کی وجہ سکندر لودھی کے عہد حکومت میں شعائر اسلام کا رواج پذیر ہونا بڑا سبب تھا، عبدالحق محدث دہلویؒ اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

''دور اسکندر یہ کہ زمانِ اصلاح وورع ودیانت وصیانت بود، بسیار ازاکابر علماء از اطراف واکناف عالم از عرب وعجم دراں زماں تشریف آوردہ دریں دیار توطن فرمودن۔'' [۲۴]

(ترجمہ: سکندری سلطنت جو کہ اصلاح، پاکیزگی دیانت اور پاکبازی زمانہ تھی، اس وقت بہت سارے بڑے بڑے علماء، عرب وعجم اور ہر گوشے وکنارے سے یہاں تشریف لائے اور اسے اپنا وطن بنایا)

شیخ عبدالقدوسؒ نے اپنے ابتدائی زمانے میں سلسلے کے اکابرین کے اصول کے مطابق

سیاست اور حکمرانوں سے کسی طرح کا کوئی تعلق قائم نہیں رکھا تھا، یہی وجہ تھی کہ جب کبھی قاضی محمود داروغۂ ردولی شیخ عبدالقدوس سے ملاقات کے لئے حاضر ہوتا تو اس کی آمد کی خبر سن کر شیخ عبدالقدوس کسی ویرانے کی طرف نکل جاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ ان دنیاداروں سے ناگوار بو آتی ہے، اسی لیے میں ویرانوں میں چلا جاتا ہوں۔[۲۵]

مگر بعد میں شیخ عبدالقدوس نے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس کیا کہ مخلوقِ خدا اور دین و شریعت کی حفاظت کی خاطر ان کا شاہانِ وقت سے تعلق قائم ہونا ضروری ہے، یہی وجہ تھی کہ جس نے انھیں باقاعدہ اپنے وقت کے سلاطین وامراء سے روابط قائم کرنے پر آمادہ کیا اور انھوں نے ان حکمرانوں کو تلقین وہدایت کے خطوط لکھے، مخلوق کی خدمت ان کی غم خواری، ائمہ اور علماء کی تیمارداری اور ان کی تعظیم وتوقیر کی طرف توجہ دلائی۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اسلامی حکومت کے سربراہوں، فرمانرواؤں اور امراء کو کن اوصاف سے متصف ہونا چاہیے اس طرف بھی اشارے فرمائے۔ اور انھیں لکھا: **الناس علی دین ملکو کھم** کے اصول کے مطابق بادشاہوں اور ان کے عاملوں کو چاہیے کہ وہ احکام شرع کے ادا کرنے میں پوری پوری احتیاط سے کام لیں، تاکہ ان کو دیکھ کر عوام وخواص بھی شریعت کے پابند ہوں اور لوگ شریعت سے آراستہ وپیراستہ ہوں۔ اسلام کا بول بالا اور علماء وصلحاء کی عزت ہو۔

شیخ عبدالقدوسؒ نے لودھیوں سے لے کر مغلوں تک تقریباً پانچ فرمانرواؤں کا زمانہ دیکھا تھا، بہلول لودھی، سکندر لودھی، ابراہیم لودھی، بابر اور ہمایوں، ان پانچوں حکمرانوں اور ان کے امراء کو خطوط کے ذریعہ شیخ عبدالقدوس نے اعلائے کلمۃ الحق۔ اتباع شریعت، عدل وانصاف اور احترام علماء کی طرف توجہ دلانے کا اہم فریضہ انجام دیا مکتوبات قدوسیہ میں شیخ عبدالقدوسؒ کے یہ خطوط محفوظ ہیں مگر ہم یہاں ان کے تین خطوط بطور نمونہ پیش کررہے ہیں، جن سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے میں نظام اسلام کے قیام کے لیئے کتنی سعی وکوششیں کی۔

سکندر لودھی کے نام خط

''مطلق العنان فرمانروائی اور فرضِ منصبی کی عظیم الشان ادائیگی یہ ہے کہ اپنے اعمال اور مصروفیات میں بھی صلحاء، علماء، اتقیاء اور اولیاء کے تمام

گروہوں اور دین کی راہ میں جنگ کرنے والوں اور مستحکم دربار کے
مجاہدوں کے ساتھ عدل وانصاف برتنا اس لیے کہ ایک لمحے کا انصاف اس
کی ساٹھ سالہ عبادت سے افضل اور بہتر ہے۔

دنیا میں ائمہ اور مجبور علماء کا ایک گروہ ہے چاہئے کہ آپ کے جیسے مبارک فرمانروا اور دنیا پر حکومت کرنے والی سلطنت کے زمانے میں وہ لوگ ایسی رونق اور عزت حاصل کریں کہ ہر زمانے اور ہر مملکت کے مقابلے میں انھیں عزت و بڑائی حاصل ہو اور سارے فاجر لوگ آپ جیسے فرمانروا کی سلطنت کے حلال اور آبدار تلوار کے خوف سے عدم کی اندھیری رات کی سیاہی میں سما جائیں اور غائب ہو جائیں، پس اگر آپ جیسے حکمراں خدانخواستہ کمزوروں صلحاء اور مشائخ کی غم خواری اور تمیار داری، مہربانی اور کامیابی کے ساتھ نہ کریں اور ان لوگوں سے غفلت برتیں اور بے خبر ہو جائیں تو پھر ہر طرف فتنہ وفساد حکمرانی کرے گا، اسی بنا پر یہ بات یقینی ہوئی کہ انسان کی بزرگی کا درجہ دو کاموں پر منحصر ہے اور ہمیشگی کی سعادت اس دنیا اور اس دنیا کی دولت بھی اسی سے متعلق ہے، یعنی خداوند تعالیٰ کی فرمانبرداری، صدق و اخلاص سے کرنا دوسرے خلق اللہ کی خدمت اپنی سکت اور طاقت کے مطابق کرنا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(دو عادتیں ایسی ہیں کہ جن سے بہتر کوئی چیز نہیں اللہ پر مکمل ایمان رکھنا اور اس کی مخلوق کو نفع پہنچانا) ان دونوں نیکیوں کا اجتماع کاملاً سلطان کی ذات میں ہے کہ اس کا فائدہ اور اس کی شفقت تمام دنیا والوں کے لیے ہے، کتنا اچھا ہے وہ دین اور دنیا کہ جب دونوں مل جائیں اس کی تفسیر اور یہ دولت بلند ہمت سے حاصل ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ تمام چیزوں سے بلند و برتر ہو جائے اور اس چیز کو ''فتوت'' کہتے ہیں اس قول کے مطابق کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے، یعنی اس کا حال یہ ہوتا ہے، ہر وہ شخص جو صاحب ہمت ہو اور وہی مرد بہادر کہلایا خورشید کی مانند وہ اپنی بلندی میں ممتاز و یکتا ہوا بادشاہ کو بلند ہمت ہونا چاہیے۔ روپیہ پیسہ، مرتبہ اور بزرگی فقراء اور صلحاء پر نثار ہونا چاہیے ان کی محبت کی خدمت میں اس سعادت کے لیے وہ کوشاں رہے، جس نے علم اور علماء کو عزیز رکھا اس نے گویا پوری زندگی کامیابی کے ساتھ گذاری، ذیل کی عبارت میں یہ بات ظاہر اور روشن ہے، اے داؤد جب تم میرا کوئی طالب دیکھو تو پوری طرح سے اس کے خادم ہو جاؤ۔'' [۲۵]

بابر کے نام خط

مغل فرمانرواؤں میں بابر وہ پہلا حکمراں ہے کہ جسے شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے نظام اسلامی کے قیام، شریعت اسلامیہ کے فروغ، عدل وانصاف اور حکومت کے نظام کو خلافت راشدہ کے طرز پر ڈھالنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا تھا کہ شہروں کو شریعت محمدیہ کے جمال وعدل سے آراستہ کیا جائے، زکوٰۃ کے علاوہ جو بھی ٹیکس مقرر کئے جائیں وہ شریعت اسلامیہ کے مطابق ہونے چاہیے۔ ملک کے علماء، ائمہ اور ضعفاء کو اتنی عزت دینی چاہیے کہ وہ ہر زمانے اور ہر ملک میں عزت وقدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں۔ حکومت کے عہدوں پر امین اور متدین لوگوں کو متعین کیا جائے تاکہ وہ خود بھی اسلام کے پابند ہوں، نماز باجماعت ادا کریں اور اس طرح دین کمال کو پہنچے۔

تیماردار، فقراء، صغفاء، صلحاء، مشائخین ومساکین کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بابر کو لکھتے ہیں:

> ''اگر خدانخواستہ وہ (بادشاہ) فقراء، ضعغاء، علماء، مشائخ، مساکین کی خبرگیری وغمخواری میں غفلت اور سستی برتتا ہے تو یہ اس کی تباہی کا باعث ہوگا۔ یہی کرنا چاہیے اور یہی اس کو زیب دیتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لئے انصاف وعدل کا اس طرح سایہ کرے کہ کوئی شخص کسی شخص پر ظلم نہ کرے اور تمام مخلوق وسپاہ شرع کے مکمل اور مستحکم وہ احکام جن کو کرنے کا حکم دیا گیا اور جن باتوں کے لیے منع کیا گیا اس کے لیے مستقل مزاج اور باعزم ہوجائیں۔ نماز باجماعت پڑھیں، علم اور علماء کو عزیز رکھیں۔ ہر شہر میں بازار کے پاسبان ومحافظ مقرر کئے جائیں تاکہ شہر اور بازار کو شرع محمدی کے انصاف کے حسن سے سنواریں اور روشن ومنور کریں۔
>
> جیسا کہ خلفائے راشدین واسلاف کے عہد میں شرائط کا اجتماع بے خوف وخطر تھا اسی طرح دنیا کو رونق بخشنے والے کے مبارک دور میں اس کی بے خوف ادائیگی ہو اور دین اپنے عروج پر پہنچے اور اس دور کی وجہ سے قرونِ

قرنی کے عہد کی برکتوں کا حسن ظاہر ہو۔ اس کی سلطنت میں دیندار پاک مسلمان، چالاک امن مضبوط و مستحکم عقائد والے افراد عہدوں پر متعین و مقرر ہوں۔ مال کا محصول شریعت کی رد سے وصول کریں۔ کتنا اچھا ہے وہ دین اور دنیا کہ جب دونوں ساتھ ہوں اور وہ شاہ عالم پناہ اس کے سامنے خوش حال ہو۔

حال اور مستقبل کی تمام مخلوق امرادہ فقاء پر بے حساب احسان کرنے میں مصروف ہے، اسی میں دونوں جہاں کی سعادتوں اور دولتوں کی پیش گوئی اور وعدہ کیا گیا ہے۔ جب تک ہوایسا ہی اور اس سے بھی زیادہ ہو۔'' [۲۶]

مغل حکمرانوں میں ہمایوں دوسرا حکمراں تھا جسے شیخ عبدالقدوسؒ نے دو خطوط لکھے ہیں۔ پہلے مکتوب میں ہمایوں کو اخلاق حمیدہ سے متصف ہونے پر مبارک باردی۔ [۲۷]

اپنے ایک مکتوب میں ہمایوں کو خدمت خلق، علماء صلحا کی خبر گیری وخدمت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''فقراء کی محبت عروۃ الوثقی ہے اور علماء و صلحاء پر احسان تَمَسُّکْ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی ہے ہر مرض کے لیے دوا، اور ہر مشکل کے لیے باعث نجات ہے، خدا کا شکر ہے کہ تم خدمت خلق میں، خصوصاً علماء وفقراء کی خدمت میں مشغول ہو، مجھے یقین ہے کہ علماء تمہاری مملکت میں اس سے بھی زیادہ امن وامان سے رہیں گے اور وہ افتخار واعزاز حاصل کریں گے جو پہلی حکومتوں اور بادشاہوں سے بڑھ جائے گا، ان پر جو بھی داود دہش ہو وہ دفتری دار دگیر سے آزاد ہونی چاہیے تاکہ اس کو بہانہ بنا کر نا اہل شغل و عمل میں تفرقہ نہ ڈال سکیں۔'' [۲۸]

ہمایوں کے عہد حکومت میں شیخ عبدلقدوسؒ تقریباً سات سال حیات رہے اور بادشاہ کو خود بھی شیخ عبدالقدوس سے بڑا تعلق وعقیدت تھی، چنانچہ وہ ان کی خدمت میں حقائق ومعارف سمجھنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ صاحب مرادالاسرار لکھتے ہیں:

''نصیرالدین ہمایوں بادشاہ حقائق ومعارف سمجھنے کے لیے آپ کی خدمت
میں حاضر ہوا کرتا تھا، کیونکہ آپ اس فن میں ممتاز تھے۔''[۲۹]

ہم نے یہاں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے صرف چار خطوط بطور نمونہ پیش کیے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے تمام مکاتب جوانھوں نے اپنے مریدوں، صاحبزادوں، عزیزوں اور اس دور کے علماء و مشائخ وغیرہ کو لکھے ہیں وہ ان کی اصلاحی کوششوں اور روحانی تربیت جیسے بلند مقاصد کو سامنے لانے میں ہماری بہت مدد کرتے ہیں اور جن سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شیخ عبدالقدوسؒ نے ساری عمر اسی جدوجہد میں گذاری۔ ان کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ انسان اور انسانیت اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کے ذریعے ترقی حاصل کریں اور معاشرے میں موجود ساری خرابیاں ختم ہوجائیں یا وہ ساری برائیاں جو معاشرے میں خرابی پیدا کرنے کا سبب ہیں وہ بھی ختم ہوجائیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے لکھے گئے خطوط رشد وہدایت کے کارناموں کے آئینہ دار ہیں، حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبدالقدوس کی ان تعلیمی، روحانی اور معاشرتی اصلاحی کوششوں نے انھیں سلسلہ چشتیہ صابریہ کا مجدد بنا دیا، اور ان کے ذریعے سلسلے کو حیات نو اور ایک نیا ہی رنگ حاصل ہوا چنانچہ ایک مکتوب میں اپنے بارے میں خود تحریر فرماتے ہیں:

''من ایں سلسلہ را رنگ دیگر بخشیدہ ام۔'' [۳۰] (ترجمہ: میں نے اس سلسلے
(چشتیہ صابریہ) کو دوسرا ہی رنگ بخشا ہے)

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا مسلک

تصوف میں وحدت الوجود کے مسئلے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ کے علاوہ اس وقت برصغیر میں جو سلسلے رائج تھے ان کے متقدمین صوفیاء پر وحدت الوجودی رنگ غالب تھا۔ سلسلہ چشتیہ کے دوسرے بزرگوں کی طرح شیخ عبدالقدوس بھی اس کے قائل تھے اور دسویں صدی ہجری میں نظریہ وحدت الوجود کی تبلیغ واشاعت میں انھیں نے غیر معمولی حصہ لیا۔ لیکن وہ اس نظریہ کے اسی حد تک قائل تھے جس حد تک کہ اسلام مانع نہیں ہے۔

شیخ رکن الدین ان کے مسلک کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''ایک دفعہ حضرت شیخ نے گنگوہ میں نماز فجر کے بعد جماعت کی طرف حالتِ سری میں وحدت الوجود پر گفتگو فرمائی، میں اور میرے بھائی شیخ حمید اور شیخ احمد اس مجلس میں حاضر تھے، میں نے آپ سے گذارش کی کہ مسئلہ وحدت الوجود، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے کہیں بھی منقول نہیں ہے اور نہ شارح علیہ السلام نے دین کا مدار مسئلہ وحدت الوجود پر رکھا ہے اور نہ اس مسئلہ کو بیان کرتے ہیں اور اس پر اعتقا درکھتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل قیامت کے دن اس مسئلہ پر اعتقاد ہمارے لئے نفرت کا باعث اور مواخذہ کا سبب بنے۔ آپ نے میرے جواب میں فرمایا کہ اگر چہ یہ مسئلہ صراحت سے شریعت میں بیان نہیں کیا گیا ہے لیکن اشارۃ النص اور دلالۃ النص سے ہمیں اس کے متعلق بہت جگہ اشارہ ملتا ہے، بلکہ بعض جگہ تو صراحت کے ساتھ بھی ملتا ہے، لیکن اس کو علمائے ظاہر متشابہ کہتے ہیں اور ظاہر کے مطابق تاویل کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ تبع تابعین کے عہد میں ظہور میں آیا اور وہ بھی زمانہ خیر تھا اور جنھوں نے اس مسئلے کو وجود بخشا وہ مشائخین کبار مقتدیان دین اور مجتہدین وقت میں سے تھے تمام علمائے ظاہر انہی کی طرف رجوع کرتے تھے ہمیں ان کے قول وفعل پر اعتماد کلّی رکھنا چاہیے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر یہ مسئلہ شریعت کے خلاف ہوتا تو حضرت امام اعظم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابو یوسف، امام محمد اور دوسرے مشائخین کبار یقیناً صراحت سے اس کے بارے میں لکھتے کہ یہ مسئلہ شریعت اسلامیہ کے خلاف ہے اور ویسے بھی اگر یہ مسئلہ دین کے خلاف اور باطل ہے تو علمائے اہل سنت والجماعت کا فرض تھا کہ وہ اس پر سکوت اختیار نہ کرتے اور اس کی تردید میں مشغول ہو جاتے، کیونکہ حق کے متعلق سکوت کرنے والا گونگا شیطان ہے، جس طرح انھوں نے معتزلہ، فلاسفہ اور دوسرے گمراہوں کی

تردید کی اسی طرح اس نظریہ کی بھی تردید کرتے، پس جب ائمہ دین نے اس مسئلہ میں سکوت اختیار کیا ہے اور اس کا ردّ وانکار نہیں کیا تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ مسئلہ دین کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ بیان کے وقت میں خاموشی خود بمنزلہ اقرار ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے، بعض کثرت وجود کے قائل ہیں، جو کثرت وجود کے قائل ہیں وہ علماء ظاہر ہیں، اکثر زہاد، عابدین اور مشائخ کبار اسی مسلک پر ہیں، بعض وحدت الوجود کے قائل ہیں، یہ بھی موحد اور عرفان حقیقت وجود ہیں، ان میں بھی جلیل القدر علماء اور مجتہدان وقت ہیں اور اہل حق کا کشف بھی اس کے حق ہونے پر شاہد ہے، یہ مسئلہ مختلف فیہ تو ہے لیکن مخالف دین نہیں اور نہ بندے کے لیے اخرت میں مضر ہے، مسئلہ وحدت الوجود، اسرار الٰہی میں سے ہے اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کا تعلق باطنی سر بلندیوں سے ہے، ہر آدمی ہر مرتبہ کے لائق وسزاوار نہیں، یہ مسئلہ اسرار الٰہی میں سے ہے، اس لیے اس کے اظہار کو بھی کفر کہا گیا ہے، اسی لیے جب کوئی منصور حلاّج، انا الحق کا نعرہ لگائے گا اسے دار پر جانا پڑے گا، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسائل کی نوعیت مختلف ہے، مثلاً معذور کا مسئلہ علاحدہ ہے اور تندرست کا مسئلہ اس سے مختلف ہے، اسی طرح مسائل شریعت، طریقت اور حقیقت جدا جدا ہیں، اسی لیے کلمہ طیبہ کے مفہوم ومطالب میں لا یعوذ الا اللہ مسئلہ شریعت لامقصود الا اللہ مسئلہ طریقت ہے اور لاموجود الا اللہ مسئلہ حقیقت ہے۔

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسئلہ وحدت الوجود میں محققین کے اختلاف کی بنیاد ایک دوسرے ہی اختلاف پر مبنی ہے، جو لوگ کثرت الوجود کے قائل ہیں وہ ذات حق سبحانہ تعالے کو کہ واجب الوجود ہے ماوراء الوجود کہتے ہیں کہ جس کو ہماری عقل ادراک نہیں کرسکتی، وہ لوگ وجود کو صفت لازمی اس ذات کا قرار دیتے ہیں کہ وجود اس ذات سے ازلاً وابداً جدا نہیں ہوتا اور جو لوگ وحدت الوجود کے قائل ہیں

وہ حق سبحانہ وتعالیٰ کو عین وجود مطلق قرار دیتے ہیں۔اس لیے کہ موجودیت میں اعلیٰ مرتبہ وجود مطلق ہے اور وہی واجب الوجود ہے۔'' [۳۲]

شیخ رکن الدین مزید فرماتے ہیں:

''کہ جب یہ مجلس برخواست ہوئی تو حضرت شیخ کو یہ خیال ہوا کہ ابھی یہ لڑکے علم معرفت میں ناقص ہیں اور مسئلہ وحدت الوجود کے منکر ہیں، اس لئے آپ نے فرمایا کہ میں اب ان لڑکوں کے ساتھ نہیں رہوں گا کہ ان کا مسلک ومشرب اور میرا مسلک ومشرب جدا جدا ہیں، پھر میں اور یہ کیسے اکٹھے رہ سکتے ہیں، یہ کہہ کر عالم جذب ومستی میں حضرت شیخ وہاں سے روانہ ہو گئے، اس وقت جتنے لوگ بھی وہاں موجود تھے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔اسی حالت میں جمنا کے کنارے تک پہنچ گئے اور ارادہ تھا کہ تھانیسر جا کر شیخ جلال تھانیسری سے بھی معلوم کریں کہ وہ اس مسئلے میں کیا مذہب و مشرب رکھتے ہیں، آخر کار امیر شاہ اسلام نے جو اس وقت ہمایوں کی جانب سے گنگوہ کا داروغہ مقرر تھا، آگے بڑھ کر شیخ سے عرض کیا کہ اگر بادشاہ کو اس کی خبر ہوگئی کہ آپ گنگوہ سے تشریف لے گئے ہیں تو اس کا عتاب مجھ پر نازل ہوگا۔'' [۳۳]

غرض داروغہ گنگوہ کی منت وسماجت کے بعد شیخ عبدالقدوس کا غصہ ختم ہوا اور وہ گنگوہ واپس تشریف لے آئے مگر صاحبزادگان سے پھر بھی کافی دنوں تک ناراض رہے، بقول شیخ رکن الدین:

''آپ نے ہم کو چھوڑ دیا تھا یہاں تک کہ ہمارے پیچھے نماز بھی نہیں پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ لڑکے دوسرا ہی مشرب ومسلک رکھتے ہیں ان کے پیچھے میری نماز نہیں ہوتی۔'' [۳۴] یہ کیفیت اس وقت تک باقی رہی جب تک کہ شیخ جلال تھانیسری کی گنگوہ آمد پر ان سے اس مسئلہ کی وضاحت نہ کر لی، یعنی کہ وہ مسئلہ وحدت الوجود میں کیا مسلک رکھتے ہیں۔شیخ جلال نے پیر و مرشد کے خیالات کے مطابق ہی بہت سے مشائخ کے اقوال کی مدد سے اس

مسلک کو ثابت کیا تو شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے کرم ومہربانی کرتے ہوئے انھیں اپنے گلے سے لگایا، اسی وقت صاحبزادگان میں سے کسی نے وحدت الوجود سے متعلق کچھ اشعار پڑھے جس سے ساری محفل پر عجیب وغریب کیفیت طاری ہوگئی۔اس واقعے کے آخر میں شیخ رکن الدین لکھتے ہیں:

''مجھ پر اور شیخ حمید اور شیخ احمد پر اس واقعے کے دو تین دن بعد تک حضرت شیخ کی خفگی رہی اس کے بعد آپ نہایت شفقت ومحبت سے ہم سے بغلگیر ہوئے اور بے انتہا نوازش فرمائی، اس کے بعد میں نے اور میرے بھائی شیخ حمید اور شیخ احمد نے وحدت الوجود کی تائید میں رسالے لکھے۔'' [۳۵] شیخ عبدالقدوسؒ، مسعود بک سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔مسعود بک آٹھویں صدی ہجری مطابق چودھویں صدی عیسوی کے مشہور صاحب سکر بزرگ تھے، زیادہ تر جذب ومستی میں غرق رہا کرتے تھے، ان کے حالات میں صاحب اخبارالاخیار تحریر فرماتے ہیں:

''حالت سکر داشت وے از مستان زیادہ وحدت وخم شکنہ خم خانہ حقیقت است، سخن مستانہ می گوید در سلسلہ چشتیہ ہیچ کسی این چنیں اسرار حقیت رافاش نہ گفتہ ومستی نہ کردہ کہ او کردہ بگویند اشک او بہ حدّ گرم بود کہ اگر بردست یکے می افتادمی سوخت۔'' [۳۶]

(ترجمہ: وہ حالت سکر میں رہا کرتے تھے وحدت کی شراب کے مستوں اور حقیقت کی شراب خانے کے خم شکنوں میں سے ہیں، وہ مستانہ باتیں کرتے ہیں، سلسلہ چشتیہ میں سے کسی شخص نے بھی اسرار حقیقت کو اس طرح فاش اور واضح نہیں کیا ہے اور ایسی سرشاری ومستی نہیں کی ہے جیسی کہ انھوں نے، کہتے ہیں کہ ان کے آنسو اس حد تک گرم ہوتے تھے کہ اگر کسی کے ہاتھ پر ٹپک جائیں تو وہ جل جاتا تھا)

شیخ عبدالقدوس ان کی سرمستی کے قائل تھے، رشد نامہ میں انہوں نے اپنے وحدت الوجودی

خیالات کی تائید میں مسعود بک کے خیالات واشعار سے مدد لی ہے۔شیخ عبدالقدوس جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ مسعود بک کی سرمستی کے قائل تھے مگر وہ خود صاحب صحو میں سے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جذب ومستی میں رہنے کے باوجود بھی شرعی احکام پر عمل کرنے میں پوری احتیاط سے کام لیتے تھے۔

شیخ رکن الدین تحریر فرماتے ہیں:

''این فقیر صحبت و خدمت حضرت شیخی ووالدی از بچشگی تا پیری یافتہ بود۔ حضرت ایشان چناں درشارع محمدی و درعقیدہ اہل سنت والجماعت راسخ القدم بودند کہ ذرہ از شرع تجاوز نہ بود وصاحب حال ومقام بودند ودر مشاہدہ نور پاک حضرت حق سبحانہ مستغرق بودند۔''[۳۷]

(ترجمہ: اس فقیر نے جب والد حضرت شیخ کی صحبت وخدمت بچپن سے بڑھاپے تک پائی تھی۔حضرت محترم شریعت محمدی اور اہل سنت والجماعت کی عقیدت میں ایسے ثابت قدم تھے کہ ایک ذرہ برابر بھی شریعت سے تجاوز نہ فرماتے تھے۔ وہ صاحب حال اور صاحب مقام تھے اور ہمیشہ حضرت حق سبحانہ تعالیٰ کے پاک نور کے مشاہدہ میں غرق رہا کرتے تھے)

شیخ عبدالقدوس کے یہاں تمام مسائل میں مسلک اہل سنت والجماعت کی سختی سے پابندی اور فقہ حنفی کی پیروی واضح طور پر نظر آتی ہے۔شرعی پابندی کا ان کے یہاں یہ عالم تھا کہ اگر کسی چیز میں ذرا بھی شبہ ہوتا اس سے پرہیز کرتے تھے۔ان کے تقوی اور احتیاط کا یہ عالم تھا کہ غیر نمازی قصّاب کے ذبیحہ کو بھی کھانا پسند نہ فرماتے تھے۔ [۳۸]

شیخ عبدالقدوس کے یہاں اس غیر معمولی احتیاط اور شرعی احکامات پر عمل کے باوجود بھی سماع سے غیر معمولی رغبت پائی جاتی ہے۔اپنی اس رغبت کے باوجود انھوں نے کبھی بھی سماع کے مسئلے کو شرعی نقطہ نظر سے جواز کا رنگ نہیں دیا بلکہ جب کبھی یہ مسئلہ شرعی نقطہ نظر سے ان کے سامنے رکھا گیا ہمیشہ شریعت کے حکم کو اپنے پر ترجیح دی اور اپنے عمل سماع کو ایک مجبور ومعذور کا عمل بتایا ہے۔

سلسلہ چشتیہ کے اکابرین سماع کو روحانی غذا قرار دیتے ہیں لیکن اس کے لیے مقررہ آداب کی پابندی بھی لازمی قرار دیتے ہیں۔شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ رشدنامہ میں سماع کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

''آب چاہ بیرون نیاید تا آنکہ اورا کشندہ بناشد ہم چناں اسرار الٰہی ست کہ در دل ست سماع پدید آرندہ آں اسرار است، و در باب سماع فتوی شرع است جائز لاھلہ وحرام بغیر واہل سماع کسے را گویند کہ ہیچ صوت جز پیام دوست نہ شنود و ہیچ جمال بغیر جمال دوست نبیند۔'' [۳۹]

(ترجمہ: کوئیں سے اس وقت تک پانی باہر نہیں آتا جب تک اسے کوئی نکالنے والا نہ ہو، یہی حال اسرار الٰہی کا ہے کہ جو تیرے دل میں ہے سماع ان اسرار کو نکال کر ظاہر کرنے والا ہے اور سماع کے باب میں شریعت کا فتوی ہے کہ وہ اہل کے لیے جائز اور نا اہل کے لیے حرام ہے اور سماع کا اہل اس شخص کو کہتے ہیں کہ سوائے دوست کے پیغام کی آواز کے کوئی دوسری چیز نہ سنے اور کوئی جمال سوائے جمال دوست کے نہ دیکھے۔)

آپؒ کی فارسی اور ہندی شاعری

شیخ عبدالقدوسؒ فارسی اور ہندی میں شاعری کا ذوق وشوق رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف اور مکاتیب میں ان کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ فارسی میں قدوسی اور احمدی تخلص فرماتے تھے، کلام میں بھرپور چاؤ، لذت، کیفیت، سادگی، دل نشینی، سوز وگداز نظر آتا ہے۔

نظریہ وحدت الوجود ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ درج ذیل غزل میں اسی نظریہ کو ایک نئے انداز میں پیش فرمایا ہے:

''غزل

من نمی گویم انا الحق یار می گوید بگو
چوں نہ گویم، چوں مرا دلدار می گوید بگو
آنچہ نتوان گفت اندر صومعہ باز اہداں
بے تحاشہ بر سر بازار می گوید بگو
بندہ قدوس گنگوہی خدارا خود شناس

ایں ندا از غیب با اسرار می گوید بگو۔''

(ترجمہ: میں انا الحق نہیں کہتا ہوں یہ تو میرا یار کہتا ہے کہ کہہ میں انا الحق کیوں نہ کہوں جب مراد لدار کہتا ہے کہ کہہ۔ وہ جو کچھ خانقاہوں میں زاہدوں سے نہیں کہا جا سکتا وہ سر بازار بے تکلف کہتا ہے کہ کہہ۔ قدوس گنگوہی کے کانوں میں یہ صدا غیب سے با سرار آتی ہے کہ خدا کو خود پہچان اور کہہ)

تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے شیخ عبدالقدوس کے کلام کے نمونے کے طور پر یہ شعر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

''احمدی در کار حق جاں را بیاز
تا شود حق یار و ہم محسن ترا''

ہندی شاعری: ان کی ہندی شاعری میں بھی فارسی شاعری کی طرح وحدت الوجودی یا صوفیانہ رنگ پوری طرح رچا بسا ہے، ہندی شاعری میں ایسا لگتا ہے کہ شیخ عبدالقدوس کسی سے اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ اپنے استاذ کے نام کا ذکر تو براہ راست کہیں نہیں کیا ہے لیکن شیخ جلال تھانیسریؒ کے نام ایک ملکتوب میں اپنے استاذ کا دوہہ نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

استادیں فقیر گوید
یہ جگ وہ جگ دیوتن من ارتھ بھندار
سائیں کے رے سیس کا جود کھر ادے بار۔'' [۴۰]

اسی دوہے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندی شاعری میں کسی کو اپنا استاذ سمجھتے تھے۔ اور خود ان کا اپنا ہندی کلام بھی ان کی تصنیف ''رشد نامہ'' میں ہمیں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ یہاں چند اشعار اں کے ہندی کلام سے بطور نمونہ پیش کئے جا رہے ہیں:

''دھن کارن پی آپ سنوارا
بن دھن کنت کنہارا
شہ کھیلے دھن با نہی ایواں

باس پھول منہ اچھے حیسواں
کیوں نہ کھیلوں تج سگ میتا
مج کارن تیں اپنا کیتا
الکھ داس آکھے سن ہودی
سوئی پاک ارتھ پہن ہوی۔'' [۴۱]

(ترجمہ: معشوق کے لئے یعنی خود اپنے آپ کو سنوارا ہے، یعنی ہر چیز میں اسی کا وجود ہے، معشوق نہ ہوتا تو پیا کہاں ہوتا، یعنی اس کی شناخت کون کرواتا، معشوق کی بانہوں میں وہ ایسے موجود ہے جیسے پھول میں ہمک موجود ہوتی ہے، اے دوست میں تیرے ساتھ کیونکہ کھیلوں (محبت کروں) کیونکہ تو نے میرے لیے یہ سب کچھ (دنیا) سنوارا ہے، الکھ داس کہتا ہے کہ پھر یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا اور پھر وہی پاک لفظ اللہ باقی رہ جائے گا)

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، ہندی شاعری میں الکھ داس تخلص فرماتے تھے۔

تصانیف

ان کی عمر کا زیادہ تر حصہ ریاضتوں، مجاہدوں، عبادات الٰہی اور مریدوں کی اصلاح و تربیت میں گذرا، مگر ان تمام مشغولیات کے باوجود بھی انھیں نے اپنی غیر معمولی علمی صلاحیتوں کی وجہ سے متعدد کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔ شیخ رکن الدین تحریر فرماتے ہیں:

''اما بعلم لدنی وفیض الٰہی چنداں استعداد بود کہ در علمے بخشہا غریب کردن و تصانیف بسیار کردند۔'' [۴۲]

(ترجمہ: علم لدنی اور فیض الٰہی سے اس قدر با استعداد تھے کہ ہر علم میں عجیب وغریب بخشیں کیں اور بہت ساری کتابیں تصنیف فرمائیں۔)

ان کی مشہور تصانیف میں درج ذیل کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔

(۱) بحرالانشعاب علم صرف کی کتاب ہے جو زمانہ طالب علمی میں لکھی تھی۔

(۲) شرح مصباح، (۳) حاشیہ شرح صحائف (۴) شرح عوارف (۵) فوائد القرات (۶) رسالہ قدوسی (۷) رشد نامہ (۸) نور المعانی، شرح قصیدہ امانی (۹) انوار العیون (۱۰) مظہر العجائب (۱۱) مجموعہ کلام فارسی (۱۲) رسالہ نور الہدی (۱۳) رسالہ قرۃ العین (۱۴) مکتوبات قدوسیہ (۱۵) اسرار العجائب (۱۶) اوراد شیخ عبدالقدوس۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی نسبی اولادوں کے سلسلے میں مختلف تذکرہ نگاروں نے اپنے اپنے اندازوں کے مطابق صاحبزادگان کی تعداد لکھی ہے، مثلاً کسی نے سات لکھی ہے اور کسی نے دس لکھی ہے۔ ہاشم کشمی نے زبدۃ المقامات میں تعداد سات لکھی ہے:

''شیخ را ہفت پسر بودہ کہ ہریک در حال وقال بے مثل بو۔''[۴۳]

(ترجمہ: شیخ کے سات صاحبزادے تھے اور ہر ایک ان میں سے حال وقال میں بے مثال تھا)

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے حالات کے سلسلے میں سب سے زیادہ معتبر یا قابل اعتبار کتاب لطائف قدوسی کو سمجھا جا سکتا ہے، کیونکہ شیخ رکن الدین کی یہ مشہور و معروف تالیف ہے جسے انھوں نے شیخ عبدالقدوس کی حیات میں ہی مکمل فرمالیا تھا۔ اس کتاب میں شیخ رکن الدین نے جہاں اپنے بھائیوں کا تذکرہ کیا ہے وہاں صرف درج ذیل چار ناموں کا ہی اظہار فرمایا ہے۔

(۱) شیخ حمید الدین (۲) شیخ احمد (۳) شیخ رکن الدین (۴) شیخ محمد علی۔

اصولی طور پر اس سلسلے میں صرف لطائف قدوسی پر ہی اعتبار کیا جانا چاہیے، چونکہ یہ کتاب شیخ رکن الدین نے شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی حیات میں ہی ان کی اجازت سے لکھنا شروع کر دی تھی اور اس کی تکمیل ان کے انتقال کے دو ماہ بعد ہوگئی تھی۔

شیخ رکن الدین لطائف قدوسی میں خود تحریر فرماتے ہیں:

''ایں فقیر بجہت جمع اوراق رخصت خواستہ وعرض کرد کہ بعضے حکایات ذات شریف کہ از زبانی مبارک شنیدہ ام وبعضے معائنہ ومشاہدہ کردہ ام یاد دارم میخواہم کہ در تحریر آرم، فرمانی شد علم ہمان است، بنا براں ہمت بر بستم وقلم

تحریراندم، بعضے حکایات درصدد حیات حضرت قطبی وشیخی در ماہ جمادی **الاول و جمادی الاخریٰ سنة اربع و اربعین و تسعمائة** مرقوم گشتند دباقی دیگر بعد از وفات با تمام پیوستند، وچوں مضمون ایں اوراق از لطائف اخبار حضرت قدوسی بودنامش لطائف قدوسی نہادم۔''[۴۴]

(ترجمہ: اس فقیر نے ادراق کو جمع کرنے کی اجازت چاہی اور عرض کیا کہ بعض حکایات جو آپ کی ذات شریف سے متعلق ہیں اور آپ ہی کی زبان مبارک سے سنی ہے اور بعض چیزوں کو میں نے خود دیکھا اور ان کا مشاہدہ کیا ہ وہ مجھے یاد ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ انھیں لکھ لوں، حکم ہوا علم یہی ہے چنانچہ اس بنا پر میں نے ہمت کی اور تحریر کا قلم چلایا، بعض حکایتیں حضرت قطبی وشیخی کی حیات کے زمانے میں ۹۴۴ھ جمادی الاول اور جمادی الآخر کے مہینوں میں ضبط تحریر میں آئیں اور باقی دوسری حکایتیں آپ کی وفات کے بعد اختتام پذیر ہوئیں، چونکہ ان ادراق کا مضمون جناب حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے عمدہ لطائف پر مشتمل تھا، اس لیے میں نے اس کا نام لطائف قدوسی رکھا)

خلفاء

تذکرہ نگاروں نے شیخ عبدالقدوس کے خلفاء کی تعداد بہت زیادہ لکھی ہے، بعض نے یہ تعداد ایک ہزار بتائی ہے۔صاحب اخبارالاخبار لکھتے ہیں:

''شیخ عبدالقدوس را مریدین وخلفاء بسیار اند۔''[۴۵]

(ترجمہ: شیخ عبدالقدوس کے مرید اور خلقاد بہت ہیں)

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے خلفاء میں صاحبزادگان کے علاوہ درج ذیل خلفاء کے نام خاص طور پر مشہور اور قابل ذکر ہیں۔

(۱) عبدالغفور اعظم پوری (۲) شیخ بھورا (۳) شیخ بڈھن جون پوری (۴) شیخ عبدالرحمٰن شاہ

آبادی (۵) شیخ عزیز اللہ دانشمند (۶) شیخ جلال تھامیری۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ان مشہور و معروف خلفاء کے ذریعے سلسلہ چشتیہ صابریہ کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ شیخ جلال تھانیسریؒ کو ان حضرات میں بھی ایک خاص مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے وصال کے بعد سلسلہ صابریہ کے فروغ اور ان کی جانشینی کی ذمہ داری شیخ جلال کے سپرد ہوئی، اس طرح سلسلہ صابریہ کا مرکز گنگوہ سے تھانیسر منتقل ہوا۔

وفات

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اپنی وفات سے تین سال قبل گوشہ نشینی اور تنہائی کی زندگی اختیار کر چکے تھے، زیادہ تر ان پر محویت اور بے خودی کا عالم طاری رہتا تھا۔ نماز کے اوقات میں خدام انھیں مطلع کرتے، ادائیگی کے بعد پھر اسی عالم جذب مستی میں غرق ہو جایا کرتے تھے، آخری ایام میں کئی روز تک بخار کے مرض میں مبتلا رہے، آخر کار چوراسی سال کی عمر میں ۹۴۴ھ مطابق ۱۵۳۰ء کو وفات پائی اور گنگوہ میں مدفون ہوئے۔

حواشی

۱۔ مولانا عبدالحئی نزہت الخواطر دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۹۵۵ء، ج سوم، ص ۲۱۳
۲۔ محمد قاسم فرشتہ تاریخ فرشتہ ۱۸۷۴ء، ص ۵۵۸
۳۔ نزہۃ الخواطر، ج سوم، ص ۱۱۹
۴۔ لطائف اشرفی بحوالہ نزہۃ الخواطر، ص ۱۱۹
۵۔ مرأۃ الاسرار قلمی
۶۔ بحوالہ شجرۂ حسب ونسب شیخ عبدالقدوس گنگوہی (اہلِ خانہ سے حاصل ہوا)
۷۔ مفتاح التواریخ آگرہ ۱۸۴۹ء، ص ۲۲۲
۸۔ شیخ رکن الدین لطائفِ قدوسی مکتبہ مجتبائی دہلی ۱۸۹۳ء، ص ۹
۹۔ کافیہ عربی گرامر کی مشہور کتاب ہے۔
۱۰۔ اصولِ فقہ کی مشہور اور اہم کتابیں ہیں۔
۱۱۔ لطائفِ قدوسی لطیفہ، ص ۸۲
۱۲۔ شیخ عبدالقدوس انوار العیون قلمی، ص ۲۵
۱۳۔ لطائف قدوسی لطیفہ، ص ۲۵
۱۴۔ ایضاً
۱۵۔ خزینۃ الاصفیا، ج اول، ص ۴۱۷
۱۶۔ انوار العیون، ص ۲۵
۱۷۔ محمد ابن احمد بن عثمان شرف المناقب قلمی کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، ص ۵۵
۱۸۔ محمد مبین مؤلف بحر ذخار قلمی نیشنل میوزیم، نئی دہلی، ص ۲۲۵
۱۹۔ ضلع سہارنپور یوپی کے شمال میں ایک قدیم قصبہ ہے۔
۲۰۔ لطائفِ قدوسی لطیفہ، ص ۷۷
۲۱۔ ایضاً
۲۲۔ ملا عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ (اردو) ۱۹۶۲ء، ص ۲۲۰
۲۳۔ لطائف قدوسی لطیفہ، ص ۷۷

۲۴۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اخبارالاخبار، ص ۸
۲۵۔ شیخ بڈھن مرتب مکتوباتِ قدوسیہ مطبع احمدی، دہلی ۱۸۹۹ء، ص ۴۴ تا ۴۶
۲۶۔ ایضاً، مکتوب ص ۱۸۹، ص ۳۳۴ تا ۳۳۵
۲۷۔ ایضاً، مکتوب ص ۱۷۵، ص ۳۳۷ تا ۳۳۸
۲۸۔ ایضاً
۲۹۔ ایضاً، مکتوب ص ۱۷۱، ص ۳۳۸
۳۰۔ مرأۃ الاسرار قلمی
۳۱۔ مکتوبات قدوسیہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۶ء، ص ۵
۳۲۔ لطائف قدوسی لطیفہ ص ۱۷
۳۳۔ ایضاً
۳۴۔ ایضاً
۳۵۔ ایضاً
۳۶۔ اخبارالاخیار، ص ۱۶۴
۳۷۔ شیخ عبدالقدوس رشدنامہ مطبع مسلم پریس چھجر یا ۱۸۹۶ء، ص ۳۵ تا ۳۶
۳۸۔ لطائفِ قدوسی لطیفہ ۲۰
۳۹۔ رشدنامہ، ص ۲۵
۴۰۔ منتخب مکتوباتِ قدوسیہ
۴۱۔ ایضاً
۴۲۔ لطائفِ قدوسی لطیفہ، ص ۸
۴۳۔ ہاشم کشمی زبدۃ المقامات، ص ۹۹
۴۴۔ لطائفِ قدوسی، ص ۳
۴۵۔ اخبارالاخبار، ص ۲۱۵

عبیداللہ فہد *

عمرانیاتِ حدیث کا عصری مطالعہ
(تفہیمات بہاولپور)

صحاح ستہ میں اشعار کے حوالے

۲۷؍نومبر ۲۰۲۲ء کو لاہور سے بہاولپور کے لیے روانگی عمل میں آئی۔ ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد صدر شعبۂ حدیث وسیرت، علومِ اسلامیہ، دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا محبت نامہ موصول ہوا تھا اور محبت کا جواب محبت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جناب محمد زاہد ظہیر اقبال کی رفاقت میسر تھی اور ایک مسلح گارڈ کی خدمات یقیناً تکریم کے لیے حاصل کی گئی ہوں گی، کیوں کہ میزبان کے نمائندوں نے راستے میں امرود، سیب اور دوسرے پھلوں سے مسلسل تواضع کر کے یہ احساس دلایا تھا کہ وہ لوگ مہمانوں کے قدر داں ہیں اور علم وادب کے متوالے بھی۔

خانیوال سے پہلے موٹروے پر ریستوران میں چائے پی گئی اور مسجد میں ظہر وعصر کی نمازیں جمع کی گئیں۔ بڑے اطمینان سے ہم پانچ گھنٹوں کی مسافت طے کر کے شام کو سات بجے یونیورسٹی مہمان خانہ پہنچ گئے۔ حافظ عبدالوحید روپڑی نے صدرِ شعبہ کی خدمت میں شہد کا تحفہ ارسال کیا تھا جو غالباً

* پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ای میل: drfahadamu60@yahoo.in

کنایہ تھا کہ روپڑی خاندان حلاوت پسند ہے، گفتگو میں بھی اور طرز عمل میں بھی۔

میں ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد سے زیادہ واقف نہ تھا۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں سالوں پہلے ایک بار سرسری ملاقات ہوئی تھی جب کہ تحفظات کی دیواریں حائل تھیں دونوں طرف سے وہ حافظ عبدالوحید روپڑی کے بھی شناسا نہ تھے۔ ہاں اُن کی تصویر دیکھ کر شرافت کے شائبہ کا گمان کیا گیا تھا۔ اب جو مہمان خانہ پہنچے تو ہجومِ عاشقاں کو منتظر اور بے تاب پایا۔ یہ لوگ صحیح معنوں میں رحمت عالمؐ کے عاشق نکلے اور اُس کے ایک گناہ گار بے علم وادب عاشق سے محبت کرنے والے (۱) ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد (۲) ڈاکٹر محمد شفیق انجم (۳) ڈاکٹر حافظ محمد صدیق (۴) ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اور (۵) حافظ محمد حسین جو ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ موضوعِ تحقیق بڑا نرالا اور دل کش ہے: اسلامی اور جاهلی ادب (کتب ستّہ میں موجود اشعار کی روشنی میں تقابلی جائزہ) حافظ محمد حسن نے دو شادیاں کی ہیں اور دونوں سے بچے ہیں دیکھنے میں معصوم اور شریف، بالکل حدیث نبوی کا مصداق 'المؤمن غر کریم' (مسلمان بھولا بھالا اور انتہائی شریف النفس ہوتا ہے۔) ان کی معصومیت ایسی قابلِ تعریف وتقلید کہ بہاولپور میں قیام کی پوری مدت میں علی الصبح روزانہ ٹفن میں ناشتہ لاتے رہے۔ ایسا اہتمام وانتظام کہ ان کی ولایت میں کوئی شبہ تک باقی نہ رہا۔ ایک روز کچھ تاخیر سے تشریف لائے۔ لجاجت سے معذرت کی: بیوی کی طبیعت قدرے ناساز ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔ تب مجھے پتہ چلا کہ اظہارِ محبت وضیافت میں اہل خانہ بھی شریک ہیں۔ یہ اُنہی کی کرم گستری تھی۔ اُنہی کا فیضان تھا، جس شخص کو ایسی وفا شعار رفیق سفر مل جائے اُس کی فلاح کے راستے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ میرے سوٹ کیس کے تالے کی چابی کہیں گم ہوگئی تو محمد حسن دوسرا تالا خرید لائے۔ ایک دن گلے میں خراش کی شکایت ہوئی تو محمد حسن ہی نے مشکل کشائی کی۔ اگلے دن گرم پانی تھرماس میں اور یونانی دوائیں بھی حاضر تھیں جوارش انارین اور حبّ جدوار خاص اجمل۔ پاکستان میں قیام کے دوران یہ دوائیں مسلسل استعمال کیں اور محمد حسن کے لیے دعائیں دل سے نکلتی رہیں۔ میں نے ایک روز موقع پا کر اُن سے موضوعِ تحقیق پر گفتگو کی کہنے لگے احادیث نبویہ میں اشعار کا استعمال بہت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کا ادبی مطالعہ اہمیت رکھتا ہے۔ پھر یہ اشعار دور جاہلیت کے شعراء کے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دورِ جاہلیت کی اعلیٰ تہذیبی قدروں اور ادبی سرمایہ کی اسلام نے حفاظت کی ہے۔

میں نے عرض کیا اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام انسانی تہذیب وتمدن کے باقیات صالحات کی برقراری اور استحکام کا قائل ہے۔ وہ اُن پر یکسر خطِ نسخ نہیں پھیرتا، انہیں توحیدی مثالیہ فراہم کرتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ناظم دینیات پروفیسر محمد تقیٰ امینی کی اصطلاح مستعار لیں تو **اسلام کی پالیسی ازالہ کی نہیں امالہ کی ہے۔**

علماء کی خطابی وقلمی کشمکش

میں نے محمد حسن کی سعادت مندی سے متاثر ہوکر یہ بھی کہا: آپ محنت سے صحاحِ ستہ کھنگالیں اور اپنا مقالہ جمع کریں۔ ڈگری ایوارڈ ہو جائے تو نظرثانی کے بعد اسے ضرور شائع کریں۔ آپ کی ترقی اور خوش حالی کا راستہ بھی کھل جائے گا۔ پُرسکون ملازمت مل جائے تو احادیث کے بقیہ مجموعوں پر بھی نظر ڈالیں اور آئندہ علمی وفکری تحقیقات کا محور اسے بنائے رکھیں۔ قبول عام بھی ملے گا اور رضائے رب بھی۔

یہ احباب رات گیارہ بجے تک محفل جمائے رہے۔ ڈاکٹر ابوالحسن مسکین صورت بنائے کوئی بات کہتے اور ڈاکٹر محمد شفیق انجم قہقہہ لگاتے اور اُن کی تقلید ہم سب کرتے۔ علمائے دین کی خوردہ چینی، فقہی ومسلکی برتری کے لیے صغریٰ وکبریٰ سے استنباطِ نتائج، اپنے مسلک کے عالم کی فاحش غلطیوں کا دفاع اور دوسرے مسلک کے عالم کی معمولی لغزشوں پر تکفیر گویا سیدنا مسیح علیہ السلام کی اپنے حواریوں پر تمثیلی تنقید کہ

''تم لوگ مچھر چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو!''

دیوبند اور بریلی کی معروف کشمکش "زلزله"، "زلـزله در زلزله" اور "زیر وزبر" جیسی مناظراتی کتابوں کے درمیان ایک بار ماہنامہ تجلی دیوبند کے ایڈیٹر عامر عثمانی (۱۹۷۵-۱۹۲۰ء) نے علمائے دیوبند کی معروف کتابوں سے اقتباسات نقل کیے اور نتیجہ نکالا کہ یہی ناقابلِ فہم وعقل، طلسماتی اور پُراسرار عقائد بریلوی علماء کے بھی ہیں پھر دونوں میں قلمی بمباری کیوں؟

علی گڑھ یونیورسٹی فورٹ انکلیو میں ۲۹/اپریل ۲۰۰۰ء کو ہم لوگ منتقل ہوئے اپنے مکان 'قصرِ فہد' میں پڑوس میں صوفی عطاء اللہ ۱۲/ربیع الاول کی مناسبت سے جلسہ کرتے تو لاؤڈ اسپیکر کی آواز اس ویرانے میں دور تک گونجتی۔ ایک جلسے میں ابّا الحاج عبارت حسین خاںؒ (متوفی ۱۳/اپریل ۲۰۲۱ء) تشریف لے گئے۔ وہ جماعت اسلامی ہند کے رکن نوجوانی ہی میں ۱۹۶۳ء میں بن چکے تھے۔ جلسہ ختم ہوا تو ابّا نے

فاضل مقرر سے سوالات کر دیے۔ اپنے بدوی لب و لہجے میں اور یہ بدویت میں نے اُنہی سے سیکھی ہے:

''مولانا! آپ نے رسول اللہ کی سیرت کم بیان کی ہے اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خبر زیادہ لی ہے۔ وہ تو اپنے اعمال کے ساتھ اللہ کے حضور پیش ہیں ہمیں بھی اپنے اعمال کی اُس کے آگے جواب دہی کرنی ہے۔''

مولانا کو طیش آیا کہ یہ کون گستاخ ہے جو سوال کر رہا ہے مگر صوفی عطاء اللہ نے معاملے کو سنبھال لیا کہ اُن کی بود و باش ہمارے درمیان ہی تھی۔ اُس کے بعد ابّا نے صوفی کے کسی پروگرام میں شرکت نہ کی۔

شیعہ علماء کی منہاجیاتِ تفسیر

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن شاکی تھے۔ ہمارا دین و اصلاحی ادب یک رُخا ہے۔ طہارت اور عبارات پر کافی زور ہے۔ سماجی معاملات نظر انداز ہو گئے ہیں اور جن علماء نے سماجی تناظر میں کچھ لکھا ہے اس میں قرآن و سنت کی راست ترجمانی نہیں ہے۔

میں نے انھیں یاد دلایا۔ شیخ یوسف القرضاوی (۲۰۲۲-۱۹۲۶ء) نے سخت افسوس ظاہر کیا ہے۔ اسلامی تاریخ میں عبادات پر سینکڑوں جلدیں تیار ہوئیں مگر زکوۃ اور بیوع (تجارتی مسائل) پر کم توجہ دی گئی۔ راقم نے خود اپنا ایک تجربہ دوہرایا۔ ۲۷-۲۹/اپریل ۲۰۱۸ء کی تاریخوں میں ایک بین الاقوامی زکوۃ کانفرنس کوچین کیرالہ کے لامیریڈین ہوٹل میں بڑے اہتمام و افتخار سے منعقد ہوئی تھی۔ میں نے ایک اجلاس عمومی کو خطاب کیا تھا میرا موضوع تھا: ''اسلامی میں زکوۃ اور خدمتِ خلق کا تصور'' میری گفتگو مکمل ہوئی تو سوال و جواب کا تہلکہ خیز اجلاس شروع ہوا۔ کشمیر کے ایک طالب علم نے فوراً سوال کر دیا کہ اسلامی ادب میں زکوۃ کے مباحث کا فقدان ہے۔ شیخ یوسف القرضاوی کی کتاب فقہ الزکوۃ کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں مگر ہند و پاک کے علماء اور مصنفین نے اس موضوع کو قابل توجہ نہیں سمجھا۔ میں نے یہ پوری بحث اپنے ایک سفرنامے میں شائع کر دی ہے۔

منزل نہ کر قبول پبلی کیشنز ڈیویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انڈیا، ۲۰۱۹ء ص: ۱۰۴-۷۷

میں نے ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن سے اُن کے مقالۂ ڈاکٹریٹ کی بابت دریافت کیا۔ انھوں نے تفسیر الکاشف پر تحقیق پر تحقیق کی ہے جو شیعہ مفسر علامہ محمد جواد مغنیہ کی شاہکار ہے۔ سات جلدوں میں

عربی میں لکھی گئی یہ تفسیر شیعہ منہاجیاتِ تحقیق کا نمونہ ہے۔

اردو ادب میں شیعہ تفسیر پر مواد کم ملتا ہے اور جو مطبوعہ لٹریچر ہے وہ آسانی سے دستیاب نہیں۔ اسی لیے میں نے اس کی طباعت پر زور دیا ہے۔ عام نوجوان محققین کی طرح وہ لیت ولعل سے کام لے رہے تھے۔ حذف واضافہ کے بغیر اسے شائع کرنے پر تیار نہ تھے۔ میں نے انھیں شعبہ سیاسیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جید استاذ پروفیسر انجم شفیق بیگ مرحوم کی روداد سنائی۔

پروفیسر انجم شفیق بیگ فکر سیاسی کے نامور استاذ تھے۔ افلاطون کی سیاسی فکر پر کام کرنے کے لیے مغرب کی کسی نامور دانش گاہ میں قیام بھی کیا تھا۔ انھوں نے موہن داس کرم چند گاندھی کے سیاسی افکار پر ایک کتاب تیار کی تھی جس کا عنوان تھا: Double truth of Ghandhi Ji وہ مسوّدہ کے صفحات پڑھ کے سناتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ گاندھی جی نے جہاں تمثیلی اور محاکاتی زبان استعمال کی ہے وہاں انھوں نے ایک ہی عبارت سے مختلف اور باہم متضاد معانی مراد لیے ہیں۔ تمثیلاتِ گاندھی کا مطالعہ ہمیں اُن کی دوہری شخصیت اور کردار سے متعارف کراتی ہے۔

میں نے متعدد بار درخواست کی کہ مسوّدہ کو شائع کرا دیجیے۔ گاندھی ازم کے ایک نئے باب کا عنوان ثابت ہوگا۔ استاذ مرحوم مسوّدہ کے نقائص شمار کراتے رہے۔ ضروری امور کی تکمیل کا وعدہ کرتے رہے۔ آخر دنیا سے رخصت ہو گئے اب مسودہ لاپتہ ہے۔

میں نے ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن سے درخواست کی کہ براہِ کرم مقالہ کو شائع ہونے دیجیے۔ اگلی طباعت میں ضرور اصلاحات اور اضافے کی پوری گنجائش موجود ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے ہمیں وفا کا انتظار ہے۔ صائب تبریزی کہہ گئے ہیں:

اگرچہ وعدۂ خوباں وفا نمی داند
خوش آں حیات کہ در انتظار می گزرد

(اگرچہ حسینوں کا وعدہ وفا نہیں جانتا، تاہم وہ زندگی کیا خوب ہے جو انتظار میں گزرتی ہے۔)

دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد میری کتابوں سے واقف نہ تھے۔ میری خوش گمانی کافور ہوگئی۔ علومِ اسلامیہ کے مختلف موضوعات پر شائع ہونے والی میری آٹھ درجن سے زائد

تصانیف پادر ہوا ہوگئیں۔ میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں میں اجنبی ہوگیا۔ ڈاکٹر ابوالحسن کا شکریہ کہ انھوں نے مجھے عرفانِ نفس کا قیمتی موقع فراہم کیا۔ حفیظ جالندھری کہتے ہیں:

کسی نے بھی نہ پہچانا وطن میں
میں سمجھا تھا بہت مشہور ہوں میں

علومِ حدیث اور سماجیات

آج ۲۸ر نومبر ۲۰۲۲ء کو شعبہ حدیث وسیرت، علوم اسلامیہ، دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے اولڈ کیمپس گھوٹولی ہال میں بین الاقوامی سمینار تھا، موضوع تھا **''سماجی مسائل میں علمِ حدیث کی افادیت''** کلیدی خطیب کی حیثیت میں مجھے دعوتِ خطاب دی تھی۔ ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد نے بتایا کہ یہ وہی ہال ہے جس میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۲۰۰۳-۱۹۰۵ء) نے سیرت پر خطبات دیے تھے جو بعد میں ''خطباتِ بہاولپور'' کے نام سے شائع اور معروف ہوئے۔ صدارت کے لیے انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب کا نام بینر پر آویزاں تھا لیکن حسبِ توقع تمام شیوخ الجامعہ کی طرح وہ غائب تھے۔ انھیں انتظامی وغیر انتظامی مصروفیات سے فرصت کہاں ملتی ہے آخر وہ وائس چانسلر تھے۔ علوم اسلامیہ کے شعبے ویسے بھی عصری جامعات میں تزئین کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں اور بس۔

پروگرام ۱۵ منٹ کی تاخیر سے شروع ہوا۔ خطبہ استقبالیہ صدر شعبہ نے پیش کیا۔ ۱۹۲۵ء میں جامعہ عباسیہ کی تشکیل سے آج تک کے ارتقائی سفر کی تاریخ، شرکائے سیمینار کو تبریک وتہنیت اور سیمینار کے اغراض ومقاصد روایتی انداز میں مگر سلیقے سے پیش کیے گئے۔

پروفیسر یونس ساجد نے بڑی مُردہ دلی دکھائی۔ تسلیم کہ ایس ای کالج کے سبک دوش استاذ تھے مگر ایسی بھی کیا سبک دوشی کی آدمی زندگی کی رمق سے محروم ہوجائے اور اپنے طرزِ عمل سے دوسروں کو بھی سبک دوش ہوجانے کی تعلیم دے۔ وہاں موجود ایک زندہ دل پروفیسر نے انھیں 'استعمال شدہ کارتوس' کا خطاب دے ڈالا۔

سید ذیشان اختر امیر جماعت اسلامی بہاولپور، الخدمت فاؤنڈیشن کے چیرمین اسٹیج پر آئے تو گویا بہاریں لوٹ آئیں۔ آواز میں طنطنہ، اسلوب میں شوکت وسطوت، گفتگو مرصّع اور دلنشیں صحیح معنوں میں متکلمانہ لب ولہجہ۔ اسم بامسمّٰی تھے۔

علامہ سید ارشد سعید شاہ کاظمی، مدیر جامعہ انوار العلوم ملتان درمیان میں تشریف لائے اور بڑے طمطراق سے تشریف لائے۔ حامیوں اور مریدوں کے طائفہ کے ساتھ کیمروں کی چکا چوند میں جیسے محفل صرف اُنہی کے لیے سجائی گئی ہو اور دیر سے آنے کا انھیں پورا حق ہو۔ اسٹیج کے مہمانان، ہال میں تشرف فرما خواتین وحضرات بہ یک جنبش ایستادہ ہو گئے کہ توہین کے سزاوار نہ ٹھہریں، دنیا وآخرت میں عقاب کے سزاوار نہ قرار دے دیے جائیں۔ یہ جاہ وجلال رخصت ہو گیا جب انھوں نے بولنا شروع کیا، انھیں خبر ہی نہ تھی کہ موضوعِ گفتگو کیا ہے، سیمینار کی تشہیر کس مقصد کے لیے کی گئی ہے، بے موقع اور بے محل گفتگو جو بیشتر تاج دارانِ شریعت کا معمول ہے۔

میں نے اپنی گفتگو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھرپور سماجی زندگی پر روشنی ڈالی۔ آپ کی تجارت، حلف الفضول میں شرکت، اہلِ مکہ کی گواہی آپ کی صداقت وامانت پر، شعب ابی طالب میں محصوری کے دوران مشرکین کے ذریعہ آپ کا امداد وتعاون، تکریم ومساوات اور وحدت آدم پر مستقل آپ کا پیغام، احادیث میں خدمت خلق اور حقوق العباد پر زور، کفو کی فقیہانہ تعبیر اور محدث حبیب الرحمٰن اعظمیؒ (١٩٩٢-١٩٠٠ء) اور فقیہ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی (٢٠٠٢-١٩٣٦ء) کے مباحث چالیس منٹ میں گفتگو مکمل ہوئی۔

غیر مسلموں سے حسنِ تعامل

غیر مسلموں سے انسانیت کی بنیاد پر حسن سلوک اور ادائے حقوق کی تاکید میری گفتگو کا ایک اہم نکتہ تھا۔ سورۃ الممتحنہ کی آیات کا حوالہ کافی تھا۔ قرآن کہتا ہے:

لا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْن. إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّيْنِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوْهُمْ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ. (الممتحنه: ٨، ٩)

اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم اُن لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا معاملہ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی

ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم اُن لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے او رتمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ اُن سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔

میں نے عرض کیا ہمارا دینی ادب اور اسلامی فکر اس معاملے میں افراط وتفریط میں مبتلا ہے۔ کہیں بے جا مدارات اور مداہنت ہے اور کہیں انتہا پسندی اور تشدد۔ صحیح رویہ وہی ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے۔ میں نے اپنا ایک چشم کشا واقعہ بیان کیا۔

یونیورسٹی فورٹ انکلیو علی گڑھ کے ہفت روزہ درس قرآن میں جو ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی کے دولت کدہ پر ۲۱ راگست ۲۰۲۲ء کو واقع ہوا تھا، راقم نے ایک سوال کے جواب میں عرض کیا کہ ہندوؤں سے سلام کلام میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں عام طور پر اُن کے سلام کے جواب میں آداب کہہ دیتا ہوں اور مزاج پرسی کر لیتا ہوں لیکن اگر کوئی انہیں سلام کرلے تو مضائقہ نہیں۔ سلام کا مطلب ہے کہ ہماری طرف سے تمہاری جان ومال کو تحفظ حاصل ہے۔

درس قرآن کے سامعین کو میں نے بچپن کا ایک واقعہ سنایا۔ اٹوا بازار ضلع سدھارتھ نگر اتر پردیش میں جماعت اسلامی کا ایک عوامی خطاب تھا۔ جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل مولانا سید حامد علیؒ (۱۹۹۳-۱۹۲۳ء) نے خطاب عام کے بعد سوال وجواب کے اجلاس میں ہندوؤں سے سلام کے جواز میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ پیش کیا جسے قرآن مجید نے نقل کیا ہے۔ انھوں نے اپنے باپ آزر کی دھمکیوں کے جواب میں اُن پر سلامتی بھیجی تھی اور فرمایا تھا:

سَلَامٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا.

ابراہیمؑ نے کہا سلام ہے آپ کو میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کردے۔ میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ (مریم: ۴۷)

ہندوؤں سے سلام وکلام

ابھی میری گفتگو مکمل نہ ہوئی تھی کہ درس قرآن میں موجود ایک سلفی عالم دین نے، جو مدینہ کی

جامعہ اسلامیہ سے گریجویشن اور جامعہ امّ القریٰ مکہ سے علوم شریعت میں ماجستر کیا ہے اور متقی ومتدین بھی ہیں، صراحت سے اعتراض کردیا کہ یہ تو ابراہیمی شریعت ہے اور ابراہیمی شریعت منسوخ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس پر آپ کے پاس کوئی دلیل ہے؟ انھوں نے صحیح مسلم کی حدیث سنائی۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا تَبـدُءُ وا الیھود ولا النصاریٰ بالسّلام** (یہودیوں اور عیسائیوں سے سلام میں پہل نہ کرو)

میں نے بلا تامّل اُن کا موقف تسلیم کرلیا مگر درس قرآن میں شریک ڈاکٹر محمد عمر فلاحی نے مدعی سست گواہ چست کا نمونہ پیش کیا۔ وہ جماعت اسلامی ہند کے رکن ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سیدنا طاہر سیف الدین اسکول میں عربی کے مستقل استاذ ہیں اور ہم سب کے دوست بھی۔ پتہ نہیں کیوں عصبیت جاہلیہ کا شکار ہوگئے اور کھڑے ہوکر بآواز بلند چیخنے چلاّنے لگے۔ میں نے بے تکلفی میں ذرا نامناسب رویہ اختیار کرلیا کہ وہ مجھ سے کافی کم عمر تھے اور کہہ دیا۔

آپ بے وقوف ہیں۔ مولانا سلفی نے اپنے موبائل سے حدیث مسلم پڑھ کر سنادی تو آپ کیوں ہنگامہ کررہے ہیں؟

ڈاکٹر محمد عمر فلاحی مزید غضبناک ہوگئے۔ چیخنے کی وجہ سے اُن کے منہ سے تھوک کے فوارے اُبل پڑے۔ تب ایک دوسرے شریکِ درس جناب محمد رضوان نے ڈانٹا

خدا کے لیے چپ ہوجایئے۔ مدرس ایک مستند عالم دین ہیں۔ اُن کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔

ڈاکٹر محمد عمر فلاحی نے ترکی بہ ترکی ڈانٹا: ''میں بھی عالم ہوں مجھے خاموش نہ کریں۔''

گھر پہنچ کے میں نے ڈاکٹر محمد عمر فلاحی کو فون کیا اور اُن سے معذرت کی۔ مجھے اُن کے انداز تکلم سے سخت رنجیدگی ہوئی۔ اُن کا یہ رنگ وروپ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ جب صحیح مسلم کی حدیث زیر بحث نکالی تو مولانا سلفی کی دیانت بھی سوالیہ نشان بن گئی۔ پوری حدیث اس طرح ہے:

لا تَبـدُءُ وا الیھود ولا النصاریٰ بالسّلام فإذا لقیتم احَدَھم فی طـریـقٍ فـاضـطـرُّوہ إلی اضیقـہ. (یہودیوں اور عیسائیوں سے سلام میں پہل نہ کرو اگر تم میں سے کسی کی راستے میں اُن سے ملاقات ہوجائے تو

انھیں مجبور کردو کہ وہ تنگ راستے پر چلیں۔)

اس کے بعد اسی حدیث کی دوسری روایت نقل ہوئی ہے حضرت وکیع سے، جس میں إذا لقیتم الیہود (جب یہود سے تمہاری ملاقات ہو) کے الفاظ ہیں۔ ابن جعفر عن شعبہ کی روایت میں ''فی اہل الکتاب'' کے الفاظ ہیں یعنی آپ نے یہ بات اہلِ کتاب کے بارے میں فرمائی ہے۔ اور حدیث جریر کے الفاظ ہیں: **إذا لقیتموھم** (جب تمہاری اُن سے ملاقات ہو) اور کسی مشرک کا متعین ذکر نہیں ہے۔

صحیح مسلم، کتاب السلام، باب النھی عن ابتداء اھل الکتاب بالسلام وکیف یردُّ علیھم (حدیث رقم ۴۱۶۷)

یہ حدیث خود صراحت کر رہی ہے کہ عام اہل کتاب اور مشرکین اس کے مخاطب نہیں ہیں۔ یہاں مخاطب وہ اہلِ کتاب ہیں جو برسرِ جنگ تھے اور جن کی پوزیشن سورہ الممتحنہ آیت ۹ میں واضح کی گئی ہے۔ قانونی زبان میں انھیں جارح و جنگ جو (Belligerent) کہا جاتا ہے۔ اس حدیث کا اطلاق عام اہلِ کتاب اور مشکرین پر، جن کی توصیف سورہ الممتحنہ آیت ۸ میں ہوئی ہے، کیسے کیا جاسکتا ہے؟

فقہ الحدیث اور خواتین کی خود اختیاری

نماز ظہر کے بعد ایک کارگاہ تھی جس کا موضوع تھا ''فقہ الحدیث کی جدید جہات'' میں نے احادیث صحیحہ میں خواتین کی آزادی، حقوق اور سماجی شراکت پر مفصل گفتگو کی اور فقہ الحدیث کی عالم اسلام میں رائج جدید جہتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ گفتگو مکمل ہوتے ہی سوالات کی یلغار ہوگئی اور یہ اجلاس بڑا فکر انگیز (Brainstorming) ثابت ہوا۔ اساتذہ کے ساتھ طالبات وخواتین نے بھی بھرپور حصہ لیا اور ایسا محسوس ہوا کہ بہاولپور میری آمد بڑی معنی خیز ثابت ہوئی ہے۔ مرد اساتذہ کے سوالات کی نوعیت یہ تھی:

سوال-۱ مسجد میں خواتین کی نماز کا ثواب زیادہ ہے یا گھر میں نماز کا؟ گویا مسجد نبوی میں خواتین کی حاضری سائل کے مردانہ ذہن کے لیے قابلِ قبول نہ تھی۔ میں نے جواب دیا: ''خواتین کا گھروں میں نماز ادا کرنا افضل ہے لیکن یہ بتایئے جو صحابیات مسجد نبوی میں باجماعت نماز ادا کرتی تھیں کیا ان کے ثواب میں کسی قسم کا شبہ ہوسکتا ہے۔ جب کہ رسول مقبول نے صراحۃً حکم دیا:

إذا إستأذنکم نساؤکم باللیل الی المسجد فأذنوا لھن''

(صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب خروج النساء الی المساجد باللیل و الغلس، حدیث: ۸۲۱)

تمہاری خواتین رات میں مسجد جانے کی اجازت مانگیں تو انھیں اجازت دے دو۔

سوال-۲ علمائے دین کے جامد رویے کی توجیہ کیا ہوسکتی ہے؟

''فتنہ'' کی تشریح اور فقہ کے معروف اصول ''سدّ ذریعہ کا غلط انطباق'' میرا جواب مختصر مگر دوٹوک تھا۔

سوال-۳ چہرہ کے پردہ کی حمایت مولانا مودودیؒ نے کی ہے اور خواتین کے لیے اسمبلی کی رکنیت پر بھی وہ مذبذب ہیں؟

''چہرہ کے پردہ کے بارے میں مولانا مودودیؒ اور محدث ناصر الدین البانیؒ کے درمیان مراسلت موجود ہے۔ مولانا مودودی کا موقف کمزور ہے جب کہ محدث البانی کا موقف معتبر اور مضبوط ہے۔ اسمبلی کی رکنیت کے معاملے میں بھی مولانا مودودی کی تحریروں سے دور رسالت کی ترجمانی نہیں ہوتی۔'' میرا جواب تھا۔

سوال-۴ ڈاکٹر جنید انور کا تھا: ''مغرب میں شمع محفل کا بیانیہ کیوں مقبول ہوا؟ اور عالم اسلام میں نسوانی تحریک نے عروج کیسے حاصل کیا؟

''مغرب میں صنعت کاری کو فروغ حاصل ہوا، اور تحریک نشأۃ نے خواتین کو بھی کلیسائی استعمار کے خلاف جدوجہد اور بغاوت پر ابھارا کیوں کہ عیسائیت کو تمام گناہوں کی جڑ قرار دیتی تھی اور اس پر ہر قسم کے جبر و ظلم کو روا سمجھتی تھی۔

عالمِ اسلام میں خواتین کی مظلومیت، کسمپرسی اور محرومی موجود تھی۔ دورِ رسالت کی آزادی اور حقوق کی ترجمانی مفقود تھی اور اسی لیے نسائی تحریکیں یہاں بھی مضبوط و مستحکم ہوئیں۔ میں نے مختصراً تجزیہ کیا۔ یہ تو واضح ہے کہ جہاں محرومی ہوتی ہے، جبر ہوتا ہے وہیں بغاوت کی چنگاری جنم لیتی ہے مگر یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ مغرب کی نسواں کی بنیاد الحاد پر تھی۔ مسلم ممالک میں یہ تحریک پہلے مرحلے میں اشتعال و احتجاج کے ساتھ ہی ابھری مگر آگے چل کر مذہب کی تعبیر نو کی حمایت اسے حاصل ہوئی۔

حدیث عائشہؓ سے ناموزوں استدلال

ڈاکٹر ابرار محی الدین مرزا سابق اسسٹنٹ پروفیسر علوم اسلامیہ دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور اس کارگاہ کی صدارت کر رہے تھے۔ وہ بار بار میری جانب دیکھتے اور بے چینی سے پہلو بدلتے۔ اِدھر سوالات کا سلسلہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ آخر کار وہ انتظار نہ کر سکے صدارتی کلمات کا۔ بول ہی پڑے۔ ''مجھے بھی ایک سوال کرنا ہے اور ابھی کرنا ہے'' میں نے درخواست کی، آپ کو آخر میں گفتگو کا پورا موقع ملے گا۔ ابھی سامعین سے مجھے تعامل کرنے دیں۔ مگر وہ الجھ ہی پڑے: ''ایک طرف عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ خواتین فتنہ میں مبتلا ہوگئی ہیں اور دوسری طرف آپ کا یہ خطاب ہے۔ ہم تو امّ المومنین حضرت عائشہؓ کے موقف کی حمایت کریں گے۔'' ڈاکٹر مرزا کا اشارہ تھا اُس روایت کی طرف جسے امام بخاریؒ نے اپنی **الجامع الصحیح** میں، **کتاب الصلوٰۃ** رقم ۸۲۶ کے تحت درج کیا ہے۔ علمائے دین اکثر اسی روایت کا حوالہ دیتے ہیں۔ امّ المومنین فرماتیں ہیں:

لو أدرک رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما أحدثَ النّساءُ لمنعَھنَّ المسجد کما منعت نساءُ بنی إسرائیل.

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان عورتوں کے کرتوت دیکھ لیتے تو انھیں مسجد جانے سے روک دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتیں روک دی گئی تھیں۔

میں نے بڑے ادب سے عرض کیا اور شائستگی و نفاست سے پیشگی معذرت بھی کر لی۔ ایک طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ فہم اور اُن کی تنبیہ ہے اور دوسری طرف وہ صحیح احادیث ہیں جو بخاری و مسلم اور الموطا میں نقل کی گئی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر صحابہ و صحابیات کا تعامل ہے۔ اب آپ بتایئے کہ ترجیح کس چیز کو حاصل ہے۔ جب کہ آپ کو معلوم ہے کہ جنگ جمل کی قیادت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے میدانِ جنگ میں کی تھی۔

طالبات کا دینی اضطراب

گھوٹولی ہال میں طالبات و خواتین کا ہجوم تھا۔ اکثریت مختلف علوم کے ریسرچ اسکالرز کی تھی۔ انھیں دین کا شعور تھا اور اپنے حقوق کا عرفان بھی۔ بھاری تعداد باحجاب تھی۔ ایک خاتون ڈاکٹر

مرزا، صدر اجلاس کو مخاطب کر کے پھٹ پڑیں:

''بازاروں میں، دفاتر میں فتنہ نہیں ہے۔ فتنہ صرف مسجدوں میں ہے، جہاں ذکرِ الٰہی سے فضا منور رہتی ہے۔ یہاں اس ہال میں، ہماری یونیورسٹی میں اکثریت طالبات کی ہے اور کوئی فتنہ برپا نہیں ہوتا۔ آخر علماء نے فتنہ کی من مانی تشریح کیوں کی؟''

میں نے عرض کیا کہ علمائے دین نے جس تصورِ مذہب کی وکالت کی ہے اُس پر تاریخ کی روایات ورسوم، مقامی اثرات و مالوفات کی چھاپ زیادہ رہی ہے۔ خیر القرون صحابہ کا دور تھا۔ بعد کے ادوار میں جہالت اور جاہلیت کی آمیزش بڑھتی گئی اور اسی لیے اصلاح وتجدید کا نظام شروع ہوا۔ مجددین و مصلحینِ وقت نے گرد وغبار سے دین کو صاف کیا اور کتاب وسنت کی ترجمانی کی۔

ایک دوسری طالبہ نے ذرا غصے سے کہا: ''خواتین کی سماجی حصہ داری ممکن نہ ہوسکی، اس کے ذمہ دار کون ہیں؟''

''اس صورت حال کی ذمہ داری جہالت اور شریعت سے لاعلمی ہے۔ مردوں میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ ناپید ہو گئے تو عورتوں میں عاتکہ بنتِ زیدؓ موجود نہ رہیں۔ مردوں نے حدیث نبوی پر عمل نہیں کیا تو خواتین نے بھی کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔'' میرا جواب صریح تھا۔

ایک تیسری طالبہ نے خواتین کے اندر پرورش پانے والے محرومی واضطراب اور لاچاری کے احساسات کی ترجمانی کی۔ آخر علمائے دین اِن سلگتے مسائل پر شترمرغ کی پالیسی کیوں اپناتے ہیں۔ مجبور ہو کے خواتین میدان میں آتی ہیں اور سرکاری و نیم سرکاری تنظیموں کی قیادت تلے وہ جمع ہو جاتی ہیں؟

میں نے بڑے کرب کا اظہار کیا: ''یہ سب بڑا المیہ ہے۔ نوشتہ دیوار پڑھنے کو کوئی تیار نہیں۔ علماء کا جامد رویہ خواتین کو الحاد کی طرف کھینچ رہا ہے۔ بڑی حکمت اور فراست کی ضرورت ہے۔''

ایک خاتون پروفیسر کا شکوہ بجا تھا:

قدامت پسندوں اور جدت پسندوں کے درمیان معتدل نظریہ اور موقف رکھنے والے علماء اور دانش ور بھی ہیں مگر بسا اوقات وہ بھی ظلمت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اُن پر تنقید کی جائے تو تکفیر کے فتوے آنے لگتے ہیں۔

میں نے کسی قدر درد سے کہا کہ دین کا کام بڑی حکمت ونفاست اور تحمل وفراست کا متقاضی ہے۔افسوس ہے کہ دین کا درداور سوز رکھنے والے نایاب ہیں۔فتووں سے دین کی تبلیغ نہیں ہوتی، اسلام پر عمل کا جذبہ رکھنے والوں کی اُن سے رہنمائی ہوتی ہے۔عمل کا جذبہ پیدا کرنا بڑی ریاضت اور بڑے مجاہدہ کا کام ہے۔

ایک سنجیدہ خاتون نے مایوسی سے تبصرہ کیا:

''خواتین کی سماجی حصہ داری بس ایک خواب ہے جو شرمندہ تعبیر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ایسا لگتا ہے کہ تبدیلی ناممکن ہے۔''

میں نے عرض کیا تبدیلی آرہی ہے۔بہت سست سہی، ہندوستان میں کل ہند مسلم پرسنل لا بورڈ نے تھوڑا ادراک کیا ہے حالات کے دباؤ میں۔صاحب فہم وعرفان علماء اپنے موقف پر نظر ثانی کررہے ہیں گو عدلیہ کے حصار میں۔

طالوتِ بے ملک

آج مغرب بعد عشائیہ کے بہانے جماعتِ اسلامی کے دانش وروں کے ساتھ علی گڑھ تحریک پر فکری وعلمی تعامل کا پروگرام تھا جو سید ذیشان اختر جیسے محبوب ومقبول رہنما نے اپنے کشادہ فارم ہاؤس پر ترتیب دیا تھا۔رفاقت کا حق ادا کیا تھا ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد کے علاوہ ان کے یاجوج وماجوج ڈاکٹر عبدالغفار اور ڈاکٹر سلطان محمود خاکوانی نے۔

ڈاکٹر عبدالغفار سراپا گل وگلزار، باغ وبہار ہیں۔ہنستے نہیں ہیں، قہقہہ لگاتے ہیں۔اور قہقہہ لگانے کے لیے کسی لطیفہ کے منت کش نہیں وہ خود اپنی زمیں باندھتے ہیں۔بحر اور قافیہ اُن کا مرہون ہوتا ہے۔مضمون خود اُن پر فدا ہوتا ہے کہ اُس کا انتخاب کیا۔جہاں محفل جماتے ہیں پاس پڑوس کو از خود معلوم ہوجاتا ہے کہ

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے

لطف یہ ہے کہ بذلہ سنجی اور ٹھٹھول انھیں پسند نہیں۔خالص دینی مزاج رکھتے ہیں اور علم گہرا۔ہاں انھیں تقویٰ کی خشکی اور دنیا بیزاری سے بیر ہے۔وہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے پروفیسر محمد عبداللہ کے بھائی ہیں مگر یاروں کے یار بھی وہ سراپا تصویر ہیں اس شعر کی:

زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کے رہو
اس زمیں کی پستیوں میں آسماں بن کے رہو

اورڈاکٹر سلطان محمود خاکوانی کو اُن کے پیر ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد نے خطاب دے رکھا ہے: **بسطةً فی العلم و الجسم** (علم اور جسم میں بسیط ہے)

یہ مستعار ہے قرآن مجید کی حسبِ ذیل آیت سے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكاً قَالُواْ أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ وَاللّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ.

(سورۃ البقرۃ: ۲۴۷)

اُن کے نبی نے اُن سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے: ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حق دار ہو گیا؟ اُس کے مقابلے میں ہم بادشاہی کے زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مال دار آدمی نہیں۔ نبی نے جواب دیا: ''اللہ نے تمہارے مقابلے میں اُسی کو منتخب کیا ہے اور اُس کی دماغی وجسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے، اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اُس کے علم میں ہے۔

مولانا مودودیؒ نے صراحت کی ہے۔ بائبل میں قبیلہ بن یمین کے اس تیس سالہ نوجوان کا نام ساؤل لکھا ہے۔ قرآن وحدیث میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے کہ طالوت نبوت کے منصب پر بھی سرفراز ہوا تھا۔ محض بادشاہت کے لیے اُس کی نامزدگی اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ اُسے نبی تسلیم کیا جائے۔

ڈاکٹر کھوکھر کے علم کی وسعت کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ ہاں جسمانی بسط وعرض سے واضح تھا۔ یہ پاکستانی طالوت البتہ ملک اقتدار سے محروم تھے۔ خوش مزاج تھے۔ ہنستے تو اُن کا شکم بہت دیر تک ہنستا رہتا۔

ذکر اُس پری وش کا

فارم ہاؤس شہر کے مضافات میں واقع تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے جماعت اسلامی پاکستان کے ارباب علم وادب برقِ طبعی اور شعلہ مقالی میں مصروف تھے۔ عشائیہ کے پُر تکلف لوازمات گرمیٔ محفل میں اضافہ کر رہے تھے۔ عشاء کی باجماعت نماز باہر لان ہی میں ادا کی گئی۔ ہوا کی خنکی نے سرد شیروانی کو ناکافی قرار دے دیا تو تنور سے قربت بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد آخر کار اندر ہال میں جانا پڑا۔ لذت کام ودہن سے فراغت وہیں ہوئی اور پھر محفل کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔

ایک صاحب علم دوست نے علی گڑھ تحریک کا ذکر چھیڑ دیا۔ سرسید احمد خاں کی مستقبل بینی، تعلیم جدید کے ذریعہ اصلاحِ امت کا مشن، علماء کے ذریعہ ان کی مخالفت کی مہم، مدرسۃ العلوم سے اینگلو محمڈن اورینٹل کالج اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک کا سفر، آزادی ہند اور تقسیم ملک کا سانحہ، ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی میں علی گڑھ تحریک کا کردار، تجدید مذہب اور تجدّد کے شاخسانے، تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ گزٹ وغیرہ میں حیرت سے اُن کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

مرتب معلومات اور تاریخ سے گہری واقفیت کے ساتھ زبان انتہائی شستہ اور شائستہ اور اندازِ بیان کی ساحری میں اندرونی جذبے کی ملاوٹ۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ آموختہ سنا رہے ہوں۔ بچا کیا گیا جو میں گفتگو میں کرتا۔ میں نے تالیاں بجائیں۔ کہنے لگے:

> ''سر، آپ اُس ادارہ میں خادم ہیں جس کا ذکر ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں۔
> ہم آپ کی زبان سے یہی کچھ سننا چاہتے ہیں۔ ہماری سماعتیں بے تاب
> ہیں علی گڑھ کے ایک فرزند سے سننے کے لیے ہمارا رواں رواں ممنون ہے
> تحریک علی گڑھ کا۔ براہِ کرم ہمیں مایوس نہ کریں۔''

میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ الفاظ بے قابو ہو گئے۔ ایسی عقیدت علی گڑھ سے، علی گڑھ والوں سے، کاش اس ادارے کے باغبان اسے محسوس کر سکتے۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ آدھا گھنٹہ سمع خراشی کی۔ علی گڑھ اور بہاولپور کے جذبے ایک تھے۔ امیدیں ایک تھیں۔ مستقبل ایک تھا۔ پھر سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔

کرناٹک میں حجاب پر پابندی اور مسلم طالبات کا بے لچک موقف۔ ایک مسلمان لڑکی کا ہندو لڑکوں کے درمیان محصور ہونا اور اُن سے لڑکی کی ڈھینگا مستی اور بعد میں جمعیت العلماء کے مولانا محمود

مدنی کے ذریعہ اُس لڑکا اکرام، عدالت عالیہ میں حکومت کے موقف کی تائید اور اُس کے بعد عدالت عظمیٰ نئی دہلی کی طرف رجوع۔

ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی وتہذیبی مسائل، دینی تعلیم کے بڑے ادارے دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، جامعہ سلفیہ بنارس، جامعہ اسلامیہ سنابل نئی دہلی، جامعہ دارالسلام عمرآباد، مدرسہ اشرفیہ مبارک پور، مرکز الثقافۃ السنیۃ کالی کٹ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعۃ الفلاح بلریا گنج، جامۃ الرشاد اعظم گڑھ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ اسلامیہ شانتاپورم سب کا ذکرِ خیر، منہج ونصاب تعلیم زیر بحث۔

سلطان فتح علی خاں ٹیپو کا تذکرہ۔ میں نے بتایا کہ جنوری ۱۹۸۴ء میں ہندوستان پبلی کیشنز نئی دہلی سے میری کتاب شائع ہوئی۔

تاریخِ دعوت وجہاد (برصغیر کے تناظر میں) صفحات ۳۹۱

اس میں سلطان ٹیپو کا ذکر نہیں تھا۔ سالوں بعد رابطہ ادب اسلامی کا ایک سیمینار ۲۸-۲۶/ فروری ۱۹۹۹ء کو بنگلور میں منعقد ہوا تو پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کی قیادت میں میسور، سری رنگا پٹنم، جامعہ منصورہ وغیرہ کی زیارت کا موقع ملا۔ میسور میں اہلِ علم کی ایک تقریب ہوئی اس میں ایک مرد درویش نے سوال کیا: ''آپ نے اپنی کتاب میں حضرت سلطان ٹیپو شہید کا تذکرہ نہیں کیا کیا آپ کو اُن کے اصلاحی کاموں سے واقفیت نہیں ہے؟'' اور میں نے خوشی سے اعتراف کیا کہ میں سلطان کے تجدیدی مقام ومنصب سے لاعلم تھا۔ ادارہ تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی کی کتاب شائع کی مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریر وتحسین کے ساتھ تب مجھے اُن کی عظمت کا، دینی خدمات کا اندازہ ہوسکا۔

ارباب علم وادب کی اش نشست میں ویلفیئر پارٹی آف انڈیا اور مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد کی کارکردگی بھی زیرِ بحث آئی۔ دیر رات واپسی ہوئی تو ڈاکٹر عبدالغفار نے دو جوڑے موزے میرے لیے خرید لیے۔ میری ضرورت انھوں نے اپنی جیب سے پوری کی۔ راستے بھر وہ پروفیسر عبدالرؤف ظفر مرحوم کے بانکپن، اُن کی نرالی اداؤں اور اظہار اخلاص ومحبت کے نرالے طور طریقوں پر فدا ہوتے رہے اور قہقہہ بردوش اِن تذکروں میں ہم سب حسب توفیق حصہ لیتے رہے۔ البتہ ڈاکٹر عبدالغفار ان فدائیانِ

عبدالرؤف ظفرؒ کے شہداء اور قتیلوں میں شامل تھے اس اُن کی قیادت ہم سب کو تسلیم تھی۔

امام شیبانی کا تفقہ

۲۹ رنومبر ۲۰۲۲ء کو جامعہ اسلامیہ احیاء العلوم چوک بغداد بہاولپور میں صبح ساڑھے سات بجے ناشتہ کا اہتمام تھا۔ یہ درس گاہ ادارہ تدریس القرآن بہاول پور رجسٹرڈ کے زیرِ انتظام دینی تعلیم کا نظم کرتی ہے۔ ناشتے کی چٹائی پر درج ذیل اصحاب فروکش تھے۔

(۱) سید ذیشان اختر (۲) سید عبدالجلیل ہاشمی (۳) محمد اعظم گجّر (۴) ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد (۵) حبیب احمد صدیقی (۶) حافظ عبداللہ (۷) ملک سراج احمد (۸) مہر محمد صدیقی (۹) ڈاکٹر شبیر احمد جامعی۔

جامعہ اسلامیہ احیاء العلوم کے طلبہ واساتذہ رُوبرو تھے۔ میرا موضوع خطاب تھا ''اسلامی بیداری میں علمی وفکری حصہ داری - سورۃ العصر کا مطالعہ'' میں نے تیس منٹ کی گفتگو میں تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی تصریح کی۔ طلبہ کو اقامت اسلام کے لیے علمی تیاری پر آمادہ کیا۔ درسیات کے ساتھ ہم درس مصروفیات میں دلچسپی لینے کی ترغیب دی۔ امہات کتب کے منضبط مطالعہ پر ابھارا۔

آخر میں ڈاکٹر شبیر احمد جامعی نے اپنی ایک قابل قدر علمی کاوش نذر کی۔ اس میں ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی کا اشتراک شامل ہے:

''امام محمد بن حسین شیبانیؒ اور ان کی فقہی خدمات''

(ڈاکٹر محمد الدّسوقی کی عربی تصنیف **الامام محمد بن حسن الشیبانی وأثرہ فی الفقہ الاسلامی** کا اردو ترجمہ) ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، صفحات ۶۲۵

امام شیبانی (۱۳۲-۱۸۹ھ/۷۵۰-۸۰۴ء) کا شمار امام ابوحنیفہ کے دو عظیم شاگردوں میں ہوتا ہے جن سے حنفی فقہ کی روایت آگے بڑھی ہے۔ امام ابو یوسفؒ کے بعد اُن کے علمی تبحر اور تفقہ فی الدین کا کوئی ثانی نہیں۔ امام ابو یوسفؒ کا معروف زمانہ کام کتاب الخراج اور الرد علی سیر الاوزاعیؒ ہے۔ امام شیبانیؒ کی تالیفات فقہ وقانون کے تمام پہلوؤں کی جامع ہیں۔ امام شیبانیؒ کی تصانیف حسبِ ذیل ہیں:

(۱) المبسوط یا الأصل	(۲) الجامع الصغیر
(۳) الجامع الکبیر	(۴) السیر الصغیر
(۵) السیر الکبیر	(۶) الزیادات

(۷) اختلاف ابی حنیفة و ابن ابی لیلیٰ (۸) کتاب الآثار

(۹) کتاب الحیی یا الحُجج (۱۰) کتاب الأمالی

فاضل مصنف محمد الدسوی کی رائے ہے کہ السیر الکبیر قانون بین الممالک کی بنیاد گزار کتاب ہے۔ امام شیبانی اسلام کی بین الاقوامی قانونی فکر ہی کے نہیں، بلکہ پوری دنیا میں قانون بین الممالک کے موسس اور بانی ہیں۔ (ص ۴۴۷)

عیسائیوں سے تعاون کا اجتہاد

صدر شعبہ حدیث وسیرت، علوم اسلامیہ، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور نے پیشگی خبردار کر دیا تھا کہ آج گیارہ بجے شیخ الجامعہ پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب سے ملاقات طے ہے۔ ڈین فیکلٹی آف اسلامک لرننگ ڈاکٹر شیخ شفیق الرحمٰن بھی ساتھ ہوں گے۔ مجھے افتتاحی تقریب سے اُن کی غیر حاضری پسند نہ آئی تھی مگر رسمی آداب کی رعایت ناگزیر تھی اور زمانہ کسی کی پسند ناپسند سے بہت بلند ہوتا ہے۔ گلدستہ سے استقبال ہوا۔ شیخ الجامعہ کے ساتھ اجتماعی تصویر کشی بھی ہوئی۔ چائے کی میز پر رسمی علیک وسلیک کے بعد کچھ تبادلۂ خیال بھی ہوا۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ علوم اسلامیہ کے شعبے کو انھوں نے چار آزاد شعبوں میں تقسیم کر کے ہر ایک کا صدر مقرر کر دیا تھا:

۱۔ شعبہ علوم اسلامیہ (عمومی)

۲۔ شعبہ قرآن وتفسیر

۳۔ شعبہ حدیث وسیرت

۴۔ شعبہ فقہ وشریعت

بعد میں کسی نے بتایا کہ شعبہ علوم اسلامیہ کے اساتذہ کی باہمی چپقلش عروج پر تھی۔ شیخ الجامعہ نے سب کو صدارت کی کرسی عطا کر دی۔ وہ سب باہم شیر وشکر ہو گئے۔ شیخ الجامعہ کی فراست قابل تحسین تھی۔ کاش دوسری جامعات اور دانش گاہوں کے سربراہ اس منہج کو اختیار کر کے ترقی کی راہیں کھول دیتے۔

میں نے شیخ الجامعہ سے یہ درخواست بھی کر دی کہ ان سارے اساتذہ کی ترقی واجب ہے۔ مجالسِ انتخاب جلد منعقد ہوں تو یہ سب آپ کے رفعِ درجات کے لیے دعائیں کریں۔ انھوں نے یقین دہانی کرائی۔

ڈاکٹر اطہر محبوب کے نانا کے والد گورکھپور اتر پردیش کے رہنے والے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد ان کا خاندان ہجرت کر گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مولانا آزاد مرکزی لائبریری میں سبحان اللہ کلکشن اُنہی کا عطیہ ہے۔ ۲۰۰۱ء میں شیخ الجامعہ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی زیارت کی تھی تو شعبہ کمپیوٹر سائنس میں اُن کا ایک محاضرہ بھی ہوا تھا۔ مولانا آزاد لائبریری کے ارباب بست وکشاد نے انھیں سبحان اللہ کلکشن کی فہرست کا ایک مطبوعہ نسخہ انھیں عنایت کیا تھا حالاں کہ لائبریری میں اُس کے تین نسخے تھے۔ انھیں یہ احسان اچھی طرح یاد تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سبک دوش پروفیسر معتصم عباسی سے اُن کی قرابت تھی۔

شیخ الجامعہ ڈاکٹر اطہر محبوب سرسید احمد خاںؒ کی فکر اور منہاجیات کے متوالے تھے۔ تعلیم جدید کے تئیں اُن کا مشن رنگ لایا۔ ہندو پاک میں جدید تعلیمی اداروں کا فیضان بڑی حد تک سرسید کا مرہون منت ہے۔ عیسائیوں سے تعاون وتعامل کی پالیسی اُن کا اجتہادی موقف تھا۔ عالم عرب اِس قسم کے تعامل کا عادی ہو چکا تھا۔ فرانسیسی استعمار سے مزاحمت ہوئی تو تعامل بھی ہوا۔ اس کے نتیجے میں مسلم دنیا کی جدت کاری ہوئی اور عرب علماء اور دانش وروں نے خود اصلاح کی تحریکیں چلائیں جن میں علماء پیش پیش تھے۔

برصغیر میں صورت حال یکسر مختلف تھی اِسی لیے سرسید کے اجتہادی موقف کی تحسین نہ ہو سکی۔ علماء نے عام طور پر اُن کی مخالفت کی۔ شیخ الجامعہ بولتے رہے۔ میں نے عرض کیا معاصر عرب دنیا پر دو ممتاز مفکرین کے اصلاحی افکار و منہاجیات کا گہرا اثر ہے:

۱۔ تیونس کے مصنف دانش ور خیر الدین پاشا (۱۸۹۰-۱۸۱۰ء) اور اُن کی کتاب "**اقوم المسالک فی معرفة احوال الممالک**" جو ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی۔

۲۔ مصر کے مصنف رفاعہ رافع طہطاوی (۱۸۷۳-۱۸۰۱ء) اور اُن کی کتاب "**تخلیص الإبریز فی تلخیص باریز**" (پیرس کے خلاصہ کی شکل میں ہونے کا انتخاب) اور "**مناهج الألباب المصرية فی مباهج الأدب المصرية**" (ادب کی عصری مسرتوں کی روشنی میں مصری عقلوں کی منہاجیات)

یہ دونوں کتابیں ۱۸۶۶ء میں یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں۔

سرسید کی مخالفت علمائے ہندو پاک نے اُن کی تفسیر میں معجزات اور اُمور غیب کی عقلی تشریح کی وجہ سے زیادہ کی۔ ویسے ایک بڑا طبقہ جدید تعلیم کو بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔

ڈاکٹر اطہر محبوب بولے: علماء کا ایک بڑا طبقہ آج بھی سرسید کو گردن زدنی سمجھتا ہے حالاں کہ اُن کا ایک اجتہاد تھا۔ اگر اُن کا اجتہاد صائب نہ تھا تب بھی وہ مستحقِ ثواب اور ہماری دعاؤں کے قابل ٹھہرے۔ آج پوری دنیا میں بین المذاہب مطالعہ کا جو غلغلہ ہے اس کی بنیاد سرسید مرحوم نے تبیین الکلام میں ڈالی دی تھی۔

شیخ الجامعہ کے کمرے سے باہر نکلے تو یونیورسٹی کے خازن پروفیسر ابوبکر نے بڑی اپنائیت سے روک لیا۔ وہ پروفیسر عبدالرؤف ظفرؒ کے برادر اصغر تھے اس لیے محبوب تھے۔ بزنس ایڈمنسٹریشن میں یوروپ سے ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ کسی کالج میں پروفیسر تھے، پچھلے تین سالوں سے افسر مالیات کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ ایک قیمتی سوٹ کا پیکٹ میرے حوالے کیا اِس معذرت کے ساتھ کہ وہ مہمان خانہ خود حاضر ہوئے تھے لیکن میں آرام کر رہا تھا اس لیے مخل ہونا مناسب تصور نہ کیا۔

ظہرانے کا انتظام ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد کے دولت کدے پر تھا۔ مچھلی، کوفتے، نہاری اور سبزی۔ اُن کی اہلیہ نے بیماری کے باوجود ثواب کمانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ ڈاکٹر عبدالغفار، ڈاکٹر محمد زاہد، ظہیر اقبال، ڈاکٹر ساجد حسین، ڈاکٹر سلطان محمود خاکوانی، ڈاکٹر محمد شفیق انجم، ڈاکٹر حافظ محمد صدیق اور ڈاکٹر ابوبکر یہ سب صاحبِ خانہ کے چاہنے والے تھے۔ اقبال نے صحیح کہا ہے:

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

فقہ الحدیث کی کارگاہ

آج ۲ر بجے سید سلمان ندوی ہال، فیکلٹی آف اسلامک لرننگ، بغداد الجدید میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ وطالبات علوم اسلامیہ کی کارگاہ تھی۔ اُن کے موضوعاتِ تحقیق کا انتخاب میری نگرانی میں ہونا تھا جسے مجلس مطالعات بعد میں حتمی شکل دیتی۔ اس اجلاس میں اسکالرز علوم اسلامیہ کے تمام صیغوں کے تھے۔ اِن میں ۱۹ ایم فل کے طلبہ وطالبات تھے۔ باہمی مشاورت کے بعد ان کے لیے حسبِ ذیل موضوعات تجویز ہوئی۔ آغاز میں تحقیق کے تقاضوں، منہاجیات اور اسلوب تحریر پر میری مفصل گفتگو ہوئی:

۱۔ محمد مکی (Muhammad and the Jews کا تحقیقی مطالعہ)
۲۔ محمد سلیم عباس (حکمرانوں کے نام مکاتیب نبوی-اسلام کے اصول سفارت کا مطالعہ)

۳۔ محمد عثمان نذیر (ہم جنس طبقہ پر اردو تحریروں کا مطالعہ)
۴۔ عبدالوہاب (خطبہ حجۃ الوداع کا تجزیاتی مطالعہ)
۵۔ سعدیہ افضل (خاندانِ نبوی میں باہمی تعلقات کا معاملہ)
۶۔ محمد افضل (والدین کے حقوق وفرائض-سیرت نبوی کا مطالعہ)
۷۔ تابندہ اصغر (قرآن مجید میں حدود وتعزیرات کا اصلاحی پہلو)
۸۔ ثنا ظفر (عہدِ رسالت کے معاشی نظام پر اہم اردو کتب کا مطالعہ)
۹۔ رمشہ رسول (دارارقم-تعلیم وتربیت کا مرکز نبوی)
۱۰۔ محمد ارشد (عہد مکی میں رسول اللہ کی سماجی زندگی
۱۱۔ ثوبیہ ستار (حلف الفضول کی عصری افادیت)
۱۲۔ صباحت سلیم (مکی دور میں حقوق العباد کا مطالعہ)
۱۳۔ اقصیٰ نواز (بچوں کی مزدوری-سیرت کی روشنی میں)
۱۴۔ حسین احمد (حجیت حدیث اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن)
۱۵۔ حفظہ مقبول (بچوں کے حقوق کا عالمی معاہدہ-ایک تجزیہ)
۱۶۔ صائمہ صدیق (ہجرت حبشہ کا مطالعہ)
۱۷۔ سید سجاد حسین بخاری (صحیح بخاری میں کتاب البیوع کا مطالعہ)
۱۸۔ محمد فیق (تحریک ختم نبوت میں بہاول پور کا کردار)
۱۹۔ سراج احمد (منکر کے خلاف حقِ مزاحمت-احادیث نبویہ کا مطالعہ)

بی ایس سی کی طالبہ امّ حبیبہ نے ایک کورس کی جگہ اپنا موضوع مقالہ منتخب کیا: ''غزوۂ خیبر کا مطالعہ''۔

پی ایچ ڈی کے لیے طلبہ وطالبات کو درج ذیل موضوعات کی تجویز رکھی گئی۔ اِن کی تعداد چودہ تھی:

۱۔ میمونہ انجم (قرآن اور بائبل میں سنن الٰہیہ کا مطالعہ
۲۔ محمد احسن علی (A Critical Staudy of Lebor's Inter-Faith Studies)

۳۔ محمد اکبر (سیرت طیبہ پر قادیانی کتب کا مطالعہ)
۴۔ عِشبہ امجد (اردو سیرت نگاری میں مسلکی رجحانات-ایک تنقیدی جائزہ)
۵۔ حافظ اسامہ منیر (تفسیر القرآن میں سیرت سے متعلق روایات کا تجزیہ)
۶۔ جمیل الرحمٰن (تفسیر الجصاص میں مکی آیات کا مطالعہ اور اُن کی عصری معنویت)
۷۔ ساجد الرحمٰن
(Modernists Approach to the Quran in the Contemporary world: A Critical study)
۸۔ حافظ محمد وقار خالد (قرآن مجید میں تعارض کا مسئلہ)
امام فخر الدین رازیؒ کے افکار کا مطالعہ
۹۔ عاطفہ حفیظ (مسائل وحقوقِ نسواں سے متعلق احادیث پر اسرائیلی روایات کے اثرات کا مطالعہ)
۱۰۔ محمد فاضل (نواب صدیق حسن خاںؒ کی تفسیر میں روایاتِ سیرت کا مطالعہ
۱۱۔ شہلا تبسم (امام ابن قتیبہؒ اور اُن کی تاویل مختلف الحدیث)
۱۲۔ محمد حسن (کتب ستہ میں موجود اشعار کا علمی وادبی مطالعہ
۱۳۔ حبیب الرحمٰن (مختلف الحدیث: امام شافعیؒ اور امام طحاویؒ کی خدمات کا مطالعہ)
۱۴۔ محمد دانش بخاری (خطبہ حجۃ الوداع اور عہدِ حاضر کے بنیادی حقوق سے متعلق بین الاقوامی معاہدے: ایک تقابلی مطالعہ)

آخر میں شعبہ علوم اسلامیہ کے ایک کارکن ایم نقاش علی نے جو بی ایس سی آٹھویں سمسٹر کے جز وقتی طالب علم بھی ہیں، سب کے سامنے مجھے ایک قیمتی گھڑی تحفے میں دی۔ انھیں کہیں سے معلوم ہوا کہ کل مسجد سے نماز ظہر کے لیے وضو بناتے وقت میری گھڑی غائب ہوگئی ہے۔ یہ سعادت مندی میری آنکھوں کو نم کرگئی۔ پیار کی یہ سوغات مجھے پاکستان میں ہر شہر سے ملی۔ جی چاہتا ہے ایم نقاش علی کی محبت کو سلام پیش کروں۔ تسنیم فاروقی کہہ گئے ہیں:

رہنا ہے چمن میں تو خوشبو کی طرح رہیے
سوکھے ہوئے پتّوں کو سب لوگ کچلتے ہیں

حلقۂ دانش کی ناگزیریت

جامع الہدیٰ اسلامک سینٹر بہاول پور کے کیمپس میں تنظیم اساتذہ پاکستان کے پچاس احباب کے ساتھ سید ذیشان اختر امیر تحریک اسلامی کے جلو میں عشائیہ کا اہتمام تھا لیکن عشائیہ سے قبل بعد نماز مغرب ہی وہ توسیعی محاضرہ دینا تھا جس کا عنوان تھا: ''دعوت دین کے تقاضے-سورہ آلِ عمران کی روشنی میں'' ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد نے میرا تعارف کرایا اور گفتگو کی دعوت دی۔ سورہ آلِ عمران کی آخری آیت پر میں نے شرح وبسط سے کلام کیا۔ چار صفات اہلِ ایمان کی بتائی گئی ہیں:

۱۔ راہِ حق میں صبر کریں یعنی ایمان وعقیدہ پر ثابت قدم رہیں۔
۲۔ قانونی وسماجی مزاحمت کی تحریک منکر کے خلاف چلائیں۔
۳۔ علمی، فکری، سیاسی اور حربی لحاظ سے دشمنانِ دین کے مقابلے کی تیاری کریں۔
۴۔ احکامِ شریعت کی ہر صورت میں تعمیل کریں اور تقویٰ کو شعار بنائیں۔

اب سوال وجواب کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ مشاہدات وملاحظات طویل تر تھے کیوں کہ دانش وروں کا مجمع تھا۔ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ تحریک اسلامی کے پاس حلقۂ دانش (Think Tank) کی کمی ہے جو مستقبل بینی کے ساتھ طویل تر مستقبل سازی بھی کر سکے؟ پہلا سوا تھا:

حلقۂ دانش تو ہے مگر اس کی تنظیم مفقود ہے۔ ارکان تحریک سے باہر کے حلقوں میں بھی ایسے اصحابِ علم وفکر کی کمی نہیں ہے جن کی دانش وری سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ تحریک اسلامی کی معمول کی مصروفیات اسے موقع ہی نہیں دیتیں کہ وہ مستقبل سازی کے لیے طویل تر منصوبہ بندی کر سکے۔ ضرورت ہے کہ احیائے اسلام اور اقامت دین سے دلچسپی رکھنے والے اصحابِ علم کا وسیع تر حلقہ منظّم ہو۔ وہ اگلے پچاس برسوں کے متوقع حالات کی تبدیلیوں، رجحانات اور محرکات وعوامل کا گہرائی سے تجزیہ کرے۔ طویل تر منصوبہ بندی کرے اور جامع الجہات ایجنڈا تیار کرے۔ یہ وہ لوگ ہوں جو فکری وعلمی لحاظ سے اتفاق رکھنے کے باوجود میدانِ عمل میں بہت زیادہ مصروف نہ ہوں۔ یہ میرا جواب تھا۔

ایک نوجوان صاحبِ علم کا مشاہدہ تھا کہ عالمِ اسلام میں اسلامی تحریکوں کو درپیش بحرانوں اور مشکلات کی وجہ سے آج کا نوجوان مایوس ہے۔ مضطرب ہے، احیائے اسلام کے تئیں اُس کی امیدوں کا چراغ ٹمٹما رہا ہے۔

میں نے عرض کیا بنگلہ دیش میں، مصر میں، فلسطین میں ہر جگہ دار و رسن اور قید و بند کے مراحل ہیں۔ اسلام اور مغرب کے گماشتوں میں جنگ برپا ہے مگر قرآن مجید تو کہتا ہے یہ حق پسندی اور عشقِ اسلام کی علامت ہے اور قرآن کے اِس اعلان پر مایوس نہیں، پُر امید ہونے کی ضرورت ہے۔ اضطراب واشتعال کی جگہ سجدۂ شکر اور تحدیثِ نعمت ضروری ہے کہ اللہ نے اسلامی تحریکوں کی لاج رکھی۔ انھیں کفر واستعمار کے سامنے سرنگوں ہونے سے بچایا۔

جفا کی تیغ سے گردن وفا شعاروں کی
کٹی ہے برسرِ میدان، مگر جھکی تو نہیں

دیکھیے قرآن کا اعلامیہ اور بشارتِ عظمیٰ کس قدر واضح اور صریح ہے:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُواْ الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْاْ مِن قَبْلِكُم مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاء وَالضَّرَّاء وَزُلْزِلُواْ حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُواْ مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللّهِ أَلا إِنَّ نَصْرَ اللّهِ قَرِيبٌ. (سورہ البقرہ:۲۱۴)

پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت کا داخلہ مل جائے گا۔ حالاں کہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ اُن پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے حتی کہ وقت کا رسول اور اُس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ سنو اللہ کی مدد قریب ہے۔

اربکان سے اردگان تک

ایک بزرگ دیر سے بولنے کے لیے بیتاب معلوم ہو رہے تھے۔ انھیں موقع ملا تو براہِ راست عرضِ مدعا کر دیا:

''جاوید احمد غامدی کی فکر اور تشریحِ مذہب کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟''

مجھ سے پہلے ناظم اجلاس ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد اُبل پڑے۔ جاوید غامدی امت کی تعمیر نہیں، تخریب کر رہے ہیں۔ نوجوانوں کو فکری انتشار میں مبتلا کر رہے ہیں۔ فقہائے کرام، محدثین عظام،

صلحائے امت کے تئیں شکوک پیدا کررہے ہیں۔ اجماع کو قابل بحث بتارہے ہیں۔ حدیث کی تشریعی حیثیت پر سوال قائم کررہے ہیں۔ مسلمان عوام مغرب کے مکر کا شکار ہیں، انہیں اور زیادہ فکری اضطراب میں مبتلا کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔

مگر جو سوالات انھوں نے اٹھائے ہیں وہ قابل بحث تو ہیں!'' اُنہی بزرگ نے لقمہ دیا: ''یہ بحث علمائے دین کے درمیان، اصحاب علم ودانش کے حلقوں میں مطلوب ہے، عام مسلمانوں میں نہیں۔ پاکستان میں لادین طبقے نے انھیں شہ دی۔ ٹیلی ویژن چینلوں نے اُن کی تشہیر کی اور اس طرح دین پسند قوتوں کے خلاف انھوں نے معرکہ آرائی کی۔ یہ تو ناقابل عفو جرم ہے۔'' ڈاکٹر ابوالحسن تیغِ بُرّاں تھے۔

ایک جوان اور متحرک شخص نے، جو انتظامات میں بھی مصروف تھا، ترکی میں اسلام کے مستقبل پر سوال کردیا: ''ترکی میں رجب طیب اردگان کے بعد دور تک خلا نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے بعد وہاں اسلام کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔'' یہ سوال ہوا تو سب ہمہ تن گوش ہوگئے گویا اُن سب کی بے چینی کی ترجمانی ہورہی تھی۔ میں نے کہا: آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ وہاں کے حالات سے عام طور پر واقفیت نہیں ہے۔ میں نے ترکی کے شہروں کو، دیہاتوں کو دیکھا ہے۔ ۲۰۱۳ء میں پندرہ دنوں کا ایک سفر کرنے کا مجھے موقع ملا۔ استنبول، انقرہ، غازی انٹپ کے شہر، بُرسہ، بارلا، اسپارٹا وغیرہ قصبات کے ترکوں سے ہم کلامی اور مصاحبت کی سعادت میسر آئی۔ میں نے ترکوں میں روحِ اسلام سے شیفتگی، عقائد دین کے تئیں ثبات واستحکام عربوں سے زیادہ دیکھا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے بہت پہلے پیش گوئی کی تھی:

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہن ہندی، نطقِ اعرابی

پروفیسر نجم الدین اربکان نے جب وزیر اعظم کی حیثیت میں ۲۸ر جون ۱۹۹۶ء کو اپنے عہد کا حلف لیا تھا اور رفاہ پارٹی نے ٹرو پاتھ پارٹی کی رہنما تانسو شیلر کے ساتھ مل کر حکومت تشکیل دی تھی اُس وقت بھی یہی خدشہ اسلام پسند حلقوں میں سر اٹھا رہا تھا کہ ترکی میں پروفیسر نجم الدین اربکان کے بعد کیا ہوگا؟ مگر قدرت کو احیائے دین اور بحالیٔ شوکتِ اسلام کا کام لینا تھا۔ اربکان نہ سہی رجب طیب اردگان سہی۔ اربکان خدمتِ دین کا کام کرکے اللہ کے حضور سرخ رو ہوئے۔ اب اردگان عالم اسلام کی دعائیں لے رہے ہیں۔ اُن کے بعد کسی اور مرد دانا کا انتخاب اللہ کرے گا۔ یہ قدرت کا نظام ہے، ہم

کیوں اپنا سر پھوڑیں۔

تکبر نہیں، عزتِ نفس

۳۰؍نومبر ۲۰۲۲ء کی صبح حافظ محمد حسن حسبِ معمول مسکراتے ہوئے تشریف لائے۔ میرے لیے پُرتکلف ناشتے کا اہتمام جو انھوں نے اپنے ذمے لے رکھا تھا گھوٹولی ہال اولڈ کیمپس اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں ہونے والی میری گفتگو کی تحسین کر رہے تھے، انھیں اس میں سلفی منہج کی عکاسی نظر آئی۔ تاہم انھوں نے سلفی تعصّبات سے اظہار براءت کو ضروری سمجھا۔

ظہرانے کا اہتمام ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد کے مکان پر تھا۔ ڈین فیکلٹی آف اسلامک لرننگ ڈاکٹر شیخ شفیق الرحمٰن بھی تشریف رکھتے تھے۔ تحریک اسلامی کے ایک کارکن محمد انس بھی موجود تھے۔ وہ شعبہ حدیث وسیرت، اسلامیہ یونیورسٹی میں ریسرچ کے طالب علم تھے۔ اپنا موضوعِ تحقیق منتخب کرنا چاہتے تھے اور فقہ الحدیث کا رگاہ سے غائب تھے۔ صدر شعبہ نے انھیں مشاورت کے لیے یہیں طلب کر لیا تھا۔ اپنی دلچسپی کے موضوعات، مطالعہ کی کتابوں کی تفصیل انھوں نے بتائی تو اُن کی طبعی مناسبت کو دیکھتے ہوئے میں نے انھیں موضوع تجویز کیا: ''سید مودودیؒ کی تفہیم الاحادیث کا تنقیدی مطالعہ'' پانچ ضخیم جلدوں میں مولانا مودودیؒ کی تحریروں کا تحسین گلدستہ مولانا عبدالوکیل علوی نے پیش کیا ہے۔ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور نے اسے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ میں نے اپنی کتاب ''جبر وجمہوریت اور سید مودودیؒ'' القلم پبلی کیشنز، کشمیر ۲۰۲۱ء میں اس کا ایک مختصر تجزیہ پیش کیا ہے۔

ظہرانے سے فراغت ہوئی تو چائے کا دور چلا۔ اس دوران ناخوش گوار صورتِ حال رونما ہوگئی۔ ڈین فیکلٹی آف اسلامک لرننگ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ یونیورسٹی مہمان خانہ میں غیر ملکی مہمانوں کا ایک وفد آج آ گیا ہے۔ جامعہ میں بعض دوسرے علمی مذاکرے بھی منعقد ہو رہے ہیں۔

میں نے تائید کی۔ آج صبح مہمان خانہ سے نکلتے ہوئے تھائی لینڈ اور ملیشیا کے بعض مہمانوں سے میری ملاقات بھی ہوئی ہے۔ ملیشیا کی ایک خاتون بین الاقوامی اسلامک یونیورسٹی کوالالمپور میں استاذ ہیں، میری شناسا بھی ہیں۔

''یہی تو مسئلہ ہے۔ آج آپ کو مہمان خانہ خالی کرنا پڑے گا۔''

میری عزتِ نفس کو طرارہ آ گیا۔ علوم اسلامیہ کے مضمون کی یتیمی مجھے بے چین کر گئی مگر ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد نے معاملے کی نزاکت بھانپ لی۔ وہ بول بڑے:

''ڈین فیکلٹی آف اسلامک لرننگ کی مراد یہ ہے کہ وہ کمرہ آپ کے لیے آج تک ہی بُک تھا۔ آج رات سے آپ میرے ذاتی مہمان ہوں گے۔ یہ یونیورسٹی کا مکان ہے۔ ایک کمرہ منسلک غسل خانہ آراستہ ہے۔ گھر کی بے تکلفی، ضیافت اور اپنائیت سب آپ کو حاصل ہوگی۔''

میں نے درخواست کی کہ ملتان کے لیے میرے سفر کا انتظام کیجیے۔ میں آج ہی یہ یونیورسٹی اور یہ شہر چھوڑ دوں گا۔ آپ پروفیسر عبدالقدوس صاحب سے میری بات کرائیے۔ مجھے یہ متبادل منظور نہیں۔ ڈاکٹر شیخ شفیق الرحمٰن نے پھر یونیورسٹی انتظامیہ سے تکرار شروع کی۔ انھیں بھی غالباً قدرے جراحتِ نفس کا اندازہ ہو گیا۔ بہرحال رات کو اُسی مہمان خانے کے دوسرے کمرے میں مجھے منتقل کیا گیا اور میں نے خاموشی اختیار کی۔

نفرت اور فرقہ پرستی کی سیاست

عشائیہ آج ڈاکٹر ابوبکر خازن اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی رہائش گاہ پر طے تھا۔ میر محفل ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد تھے ہی، ڈاکٹر عبدالغفار، ڈاکٹر سلطان محمود خاکوانی اور ڈاکٹر جنید انور کے علاوہ بعض دوسرے معززین بھی موجود تھے۔ موضوع گفتگو تھا 'امت مسلمہ کا فکری بحران' مگر ساری بحث گھوم پھر کے ہندوستانی مسلمانوں پر آ گئی۔ لو جہاد، گھر واپسی، ہجومی تشدد، ذرائع ابلاغ کی کرشمہ سازی تھی۔ اِن سارے معاملوں سے وہ لوگ واقف تھے۔ کرناٹک کا حجاب تنازعہ موضوعِ بحث بنا تو سارے حاضرین پیچ و تاب کھانے لگے۔ ایک سنجیدہ اور قدرے سن رسیدہ شخص نے ہندوستانی مسلمانوں کے تئیں اپنی فکر مندی بڑے بے ڈھب طریقے سے ظاہر کی تو مجھے اُسے لگام دینی پڑی۔

''میڈیا نے یہ خبر عام کی کہ مسلمان برقع پوش لڑکی نے اکیلے فرقہ پرستوں سے معرکہ آرائی کی مگر برقی اور مطبعی ابلاغ نے اس خبر کو جگہ دینے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ ہندو پروفیسر نے اپنی جان پر کھیل کے غنڈوں کے چنگل سے مسلمان لڑکی کو بچایا اور اسے حفاظت کے ساتھ پرنسپل کے دفتر تک پہنچایا۔'' اور میں نے دیکھا کہ حاضرین ششدر رہ گئے۔ انھیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے زور دے

کر بلند آواز سے کہا۔ یہ نفرت کے پجاری، فسطائی عناصر حکومت اور پولیس کی شہ پا کر تماشا کرتے ہیں۔ اکثریت آج بھی امن پسند ہے۔ کثرت میں وحدت اس کی شان ہے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اُس کا وظیفہ ہے۔ عدلیہ اس طرح کے واقعات کے خلاف سختی سے نوٹس لیتی ہے اور اربابِ اقتدار کی بھی سرزنش کرتی ہے۔ ہندو مذہب اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ انتخابی سیاست تمام تر اس کی ذمہ دار ہے۔

میں ان یادداشتوں کو مرتب کر رہا تھا کہ سپریم کورٹ کا ایک اہم بیان میری نظروں سے گزرا۔ عدالتِ عظمیٰ نئی دہلی کی دو رکنی بنچ نے ۲۹/ مارچ ۲۰۲۳ء کو حکومت کو تنبیہ کی کہ وہ اِن منافرانہ واقعات پر خاموش تماشائی نہ بنے۔ جسٹس کے ایم جوزف نے سالیسٹر جنرل تشار مہتہ کی معرفت حکومت مہاراشٹر سے اِن نفرت انگیز تقاریر و بیانات پر وجہ بتاؤ نوٹس جاری کیا۔ فاضل جج نے کہا کہ ملک اس وقت نفرت انگیز بیانات کے حصار میں ہے اور اس کا حل یہی ہے کہ سیاست کو مذہب سے آلودہ نہ ہونے دیا جائے۔

تشار مہتہ نے فاضل جج کے بیان سے اتفاق نہیں کیا۔ تاہم جج اپنے موقف پر اڑے رہے:

> N0, this has everything to do with politics. The politicians make use of religion.
>
> ''نہیں، اس کا تمام تر سیاست سے تعلق ہے۔ سیاست داں مذہب کا استعمال کرتے ہیں۔''

خاتون جج بی وی نگاراتھن نے بھی نفرت کی سیاست پر سخت تنقید کی۔ جسٹس جوزف کا یہ بیان چشم کشا ہے:

> The most important thing is dignity. If it is demolished on a regular basis… look at the statements being made 'Go to Pakistan… They are people who chose this country. They are like your brothers and sisters. Remember what you pledged in school 'All Indians are my brothers and sisters… maybe I am too old fashioned … I am retiring in four months, turning 70… seventy five years ago we as a

nation started a journey. Our objective was to be a country that will follow rule of law…We should never go down to that level of hate. (The Hindu, March 30, 2023)

انسان کا وقار سب سے اہم ہے۔ دیکھیے کس طرح مسلسل اس کا انہدام کیا جارہا ہے۔ ذرا اِن بیانات کو غور سے دیکھیے: پاکستان جاؤ...'' یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس ملک کو منتخب کیا ہے۔ (اپنی رہائش کے لیے) یہ تمہارے بھائی بہنوں کی طرح ہیں۔ یاد کرو، اسکول میں تم نے کیا حلف لیا تھا: ''تمام ہندوستانی ہمارے بھائی بہن ہیں... ہوسکتا ہے میں قدامت پسند ثابت ہوں... میں چار مہینوں میں پچھتر سال کا ہو کے سبک دوش ہورہا ہوں... پچھتر سال پہلے ہم نے بحیثیت ایک قوم کے ایک سفر کا آغاز کیا تھا۔ ہمارا ہدف تھا ایک ایسا ملک جہاں قانون کی حکمرانی ہوگی... ہمیں نفرت کے اِس نیچے معیار تک نہیں گرنا چاہیے۔

ڈاکٹر ابوبکر کی رہائش گاہ پر عشائیہ سے قبل اس علمی وادبی محفل میں جناب محمد انس نے اپنے موبائل پر مولانا سید جلال الدین عمریؒ امیر جماعت اسلامی ہند پر ۱۹-۱۸ر ستمبر ۲۰۲۲ء کو منعقد ہونے والے سیمینار کے مجموعۂ مقالات کی تقریب رونمائی کی، تصویری جھلکیاں دکھائیں۔ ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ نے یہ مجموعہ شائع کردیا ہے۔

''مولانا سید جلال الدین عمریؒ - افکار وآثار'' مرتب: اشہد رفیق ندوی، محمد انس مدنی اور محمد صادر ندوی، صفحات ۵۸۴، ۲۰۲۲ء، اس مجموعۂ مقالات میں میرا بھی ایک مضمون شامل ہے۔

مولانا عمری اور پروفیسر مشیر الحق کے درمیان علمی محاکمہ

اقبال کے نظریہ اجتہاد کا مطالعہ، ص: ۵۰۹-۴۸۶

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، صدر ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ نے فون پر بتایا کہ رونمائی تقریب میں امیر جماعت اسلامی ہند انجینئر سید سعادت اللہ حسینی نے بطورِ خاص میرے مضمون کا تذکرہ کیا۔

نکاحِ مسیار کا جواز

ڈاکٹر عبدالغفار ایک آن لائن ریسرچ جنرل کثیر لسانی ابصار کے مدیر ہیں۔ یہ شعبہ علوم اسلامیہ کا ترجمان ہے۔ پاکستان ایجوکیشن میں منظوری کی درخواست دے رکھی ہے۔ انھوں نے مجلس ادارت میں میرا نام شامل کرنے کا عندیہ دیا۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس علمی وادبی محفل میں سعودی عرب میں رائج نکاح کی متعدد رسوم وروایات اوران کے نتیجے میں وراثت کے تنازعوں کا تذکرہ بھی ہوا۔

سعودی عرب میں ملازم ایک پاکستانی نوجوان نے نکاحِ مسیار کے جواز اور عدمِ جواز کی بحث چھیڑ دی۔ انھوں نے نکاحِ مسیار کی تفصیل خود فراہم کی۔ یہ نکاح کی نئی شکل ہے جسے عرب ملکوں میں اختیار کرلیا گیا ہے۔ اس نکاح میں دولہا اور دولہن کی جانب سے ایجاب وقبول ہوتا ہے۔ مہر بھی متعین ہوتا ہے۔ گواہوں کی موجودگی بھی ضروری ہوتی ہے مگر زوجین اپنے بعض حقوق سے دست بردار ہوجاتے ہیں۔ اُن کے درمیان اتفاق ہوجاتا ہے کہ وہ شادی کا اعلانِ عام نہ کریں۔

میں نے عرض کیا کہ قانونی طور سے نکاحِ مسیار کے جواز میں کوئی شبہ نہیں مگر اس کی کراہیت واقع ہے۔ اعلانِ عام مستحب ہے، مسنون ہے، اسلامی تاریخ میں اس پر تعامل ہے۔ اپنے حق زوجیت سے دست برداری اور افزائش پر بلاوجہ روک لگانا بھی مقاصدِ نکاح سے متصادم محسوس ہوتا ہے۔ آگے چل کر بچوں کے حقوق اور وراثت کی تقسیم میں فساد کا اندیشہ بھی کراہیتِ مسیار کی ایک وجہ ہے۔ **رابطہ عالم اسلامی کی مجتمع الفقه الاسلامی** بھی اس طرح کے نکاح کو جائز مگر مکروہ مانتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالغفار میری گفتگو اور مباحث وتفہیمات سے متاثر ہوئے اور تجویز رکھی کہ میرے افکار وعطایا پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ تیار ہو۔ انھوں نے ایم فل کے لیے موضوع تجویز کیا۔ شریعت اسلامیہ میں خواتین کی سماجی حصہ داری کے حوالے سے اور پی ایچ ڈی کے لیے اسلامی شوریٰ اور مغربی جمہوریت کے حوالے سے۔

درس نظامی کے ساتھ عصری علوم

یکم دسمبر ۲۰۲۲ء کو صبح ساڑھے سات بجے گورنمنٹ جامعہ محمدیہ شکارپور گیٹ بہاول پور کے

اساتذہ کے ساتھ ایک خصوصی اجلاس طے تھا۔ طلبہ موجود نہ تھے کہ تعطیل تھی۔ یہ موضوع تھا: ''فکر اسلامی کی تشکیل اور اس کے عصری تقاضے'' ناظم اجلاس ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد تھے۔ مدیر الجامعہ شیخ عبداللطیف مجلس سے غائب تھے۔

جامعہ محمدیہ کی بنیاد ۲۰۰۲ء میں پروفیسر حافظ عبداللہ بہاول پوریؒ نے رکھی۔ درسِ نظامی کا شعبہ سات سالہ ڈگری کورس پر مشتمل ہے۔ میٹرک کے بعد اس شعبہ میں طالب علم کو داخلہ ملتا ہے۔ شعبہ تحفیظ القرآن سے ہر سال ۲۵ تا ۳۰ حفاظ فارغ ہوتے ہیں۔ شعبہ عصری علوم طلبہ کے میٹریکولیشن اور انٹرمیڈیٹ (سائنس اور آرٹس) کلاسیز کا نظام بناتا ہے۔ دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے تمام کوسیز اور اسناد منظور شدہ ہیں۔

حافظ محمد حسن نے بتایا کہ اِس سال سے بی ایس اسلامیات کورس کا آغاز ہو رہا ہے۔ سہ پہر کے اوقات میں تعلیم نسواں کے لیے حکومت پاکستان سے منظوری مل چکی ہے۔ سو عدد لڑکیوں کے لیے غیر مخلوط تعلیمی نظام کی یہ پہل جامعہ محمدیہ نے کی ہے۔ اس میں درسِ نظامی کے ساتھ عصری علوم کی بھرپور رعایت ہے۔ چوں کہ حجاب کا استعمال لازمی ہے اس لیے دین دار اور اسلام پسند گھرانوں کی پہلی ترجیح جامعہ محمدیہ میں اُن کی لڑکیوں کا داخلہ ہے۔

ناشتہ کا اہتمام جامعہ محمدیہ کے احاطہ ہی میں تھا۔ پرنسپل مفتی عطاء الرحمٰن وائس پرنسپل قاری ابو حمزہ اور مدیر عصری علوم حافظ محمد توقیر ارشاد کے ساتھ امیر جماعتِ اہل حدیث بہاول پور ڈاکٹر کرنل سید شفیق احمد بھی موجود تھے۔ نامساعد حالات میں بھی فکر اسلامی کی تشکیل کیسے ہو؟ اس موضوع پر گفتگو مکمل ہوئی تو سوالات و مشاہدات کا سلسلہ شروع ہوا۔

آبِ حیات اور آبِ زمزم

علمائے دین کی مجلس تھی، فقہی و قانونی امور کا زیرِ بحث آنا ناگزیر تھا۔ ایک عالم دین نے اسلامی و تجدیدی ادب میں مغربی اصطلاحات کے استعمال پر اشکال قائم کیا۔ میں نے عرض کیا کہ علامہ محمد اسد (۱۹۹۲-۱۹۰۰ء) کا موقف یہی ہے وہ اسلام کی راست ترجمانی کے لیے قرآن و حدیث کی اصطلاحات کا استعمال ناگزیر تصور کرتے ہیں۔ مگر میرا معروضہ یہ ہے کہ ترسیل و ابلاغ کے لیے اگر ہم عزل و اسلامی اصطلاح کو استعمال کریں تو اس کے ساتھ رائج معاصر تعبیرات کو بھی استعمال کریں۔ شاید

اسی لیے مولانا مودودیؒ نے اسلامی نظام حکومت کی تفہیم کے لیے ''الٰہی جمہوری حکومت'' (Theo Democracy) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

میں نے عرض کیا کہ فقہ کی قدیم نامانوس اصطلاحات بھی ترسیل کی راہ میں حجاب ثابت ہوئی ہیں۔عربی وفارسی تراکیب عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کے سر سے گزر جاتی ہیں۔ یہ بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ابھی ۷/اپریل ۲۰۲۲ء کو صبح ہمارے ایک قدیم ساتھی پروفیسر امان اللہ خاں کا فون آیا۔ وہ میڈیکل کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شعبہ میڈیسین سے سبک دوش استاد تحریک اسلامی کے دانش ور ہیں، جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودیؒ کی کتابوں کے مطالعے کے قدیم شوقین ہیں۔ تفہیم القرآن کا مطالعہ پابندی سے کرتے ہیں۔ پوچھنے لگے:

''آج کل تصنیف وتحقیق کا مشغلہ کس مرحلے میں ہے؟

میں نے انھیں بتایا کہ ابھی تازہ کتاب میری شائع ہوئی ہے:

تجدید دین اور تجدّد (منشورات پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، نومبر ۲۰۲۲ء، صفحات ۳۱۰

زور سے قہقہہ لگایا۔علمائے دین کا المیہ یہی ہے وہ زبان ایسی استعمال کرتے ہیں جو علمائے مدارس کے علاوہ دوسرا نہ سمجھ سکے۔ یہ تجدید کیا ہے اور تجدد کس بلا کا نام ہے۔ میں نے انگریزی میں ترجمہ کر دیا:

Revival of Religion and Modernity

بولے: اچھا ماڈرنٹی کو کبھی آپ نے ڈسکس کیا ہے تب تو بحث دلچسپ ہوگی۔ میں نے انھیں اپنا ایک دوسرا ذاتی تجربہ بیان کیا۔

۲۳-۱۴/نومبر ۲۰۰۸ء کی تاریخوں میں اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن ممبئی کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا۔ ٹیلی ویژن چینل پر ریکارڈنگ کے لیے ہوٹل میں میرے کمرے کے عین مقابل قیام فرما مہمان مولانا ابوالعاص وحیدی سے میں نے پوچھا کہ آج کس موضوع پر آپ اپنی تقریر کی عکس بندی کی تیاری کر رہے ہیں؟ بآواز بلند بولنے کی وجہ سے اُن کے فقرے باہر کوریڈورز میں گونج رہے تھے۔ بولے: ''امراض برص وجذام اور طب نبوی'' اسلام کے آبِ حیات نے سرگشتہ اور حیرانی عربوں کے امراض مزمنہ کا علاج کیا۔

میں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔عرض کیا: مولانا! جامعہ سلفیہ کے طلبہ سے آپ مخاطب نہیں

ہیں۔ آپ لاکھوں کروڑوں عوام سے روبرو ہوں گے۔ جو بہ مشکل اردو سمجھتے ہیں۔ برص وجذام اور امراج مزمنہ کے الفاظ تو چھوڑیے وہ آبِ حیات کا مفہوم بھی سمجھنے سے قاصر ہوں گے۔ خیر جانے دیجیے۔ چلیے ناشتہ کرتے ہیں۔

ناشتے کی میز پر مولانا عبداللہ مدنی، مولانا وصی اللہ عباس مدنی (مدرس قرآن، امام حرم مکہ) اور بعض دوسرے احباب تشریف رکھتے تھے۔ موقع کو غنیمت جان کر میں نے مولانا ابوالعاص وحیدی سے اپنی مجوزہ تقریر کے چند جملے دوہرانے کی درخواست کر دی۔ اُن سے بے تکلفی تھی، انھیں تکدر نہ ہوا۔ جملوں کی تکرار کے بعد میں نے عرض کیا: آیئے آبِ حیات لفظ کے عمومی فہم وادراک کا جائزہ لیتے ہیں۔ دیکھیے یہ نوجوان میزبان انجینئر ہیں۔ اصلاحِ معاشرہ کی مہم سے وابستہ ہیں۔ اُن کے اسلامک مشن اسکول میں ان کے بچے زیرِ تعلیم ہیں۔ اِن سے پوچھتے ہیں، آبِ حیات کا کیا وہ مطلب سمجھتے ہیں؟ اور جب اُن سے پوچھا گیا تو وہ مسکرائے پھر بولے: ''آبِ زمزم'' میں نے قہقہہ لگایا: آپ نے اندازہ کیسے لگایا؟ بولے: ''لفظ آبِ سے دونوں کے شروع میں آب کا لفظ لگا ہوا ہے۔'' اور مجلس قہقہہ لگانے لگی۔ شیخ وصی اللہ عباس مدنی ایک بزرگ اور ثقہ عالم تھے۔ اپنی ذہنی الجھن بیان کرنے لگے:

> یہ ٹیلی ویژن چینل والے ہمارے پروگراموں اور عکس بندیوں کا ویڈیو کِلپ تشہیر کی غرض سے تیار کرتے ہیں۔ اُس میں ہم سے ہاتھ ہلانے، مسکرانے اور جسم کو حرکت دینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ سراسر مصنوعی عمل ہے جو علمائے دین کے وقار اور مشن سے میل نہیں کھاتا۔ میں نے ایسی تشہیرات میں شرکت کرنے سے منع کر دیا۔

میں نے عرض کیا: رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: **لاقِ أخیکَ بوجهٍ طلیقٍ** (اپنے بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملو)

اللہ کے رسول نے انفرادی ملاقات میں مسکراہٹ اور خندہ جبینی کی تاکید کی ہے۔ ماہرین بتاتے ہیں کہ مسکرانے والا لمحے بھر کے لیے ذہنی تناؤ سے باہر آجاتا ہے اور مخاطب کو بھی اِس مسکراہٹ سے راحت اور سکون ملتا ہے۔ ٹیلی ویژن چینل پر آپ لاکھوں کروڑوں مشاہدین سے مسکرا کے ملتے ہیں اور اُن کی ذہنی کلفت کو لمحے بھر کے لیے زائل کر دیتے ہیں۔ یہ ملاقات محض تبلیغ دین اور اصلاحِ معاشرہ کے

لیے ہوتی ہے آپ اپنی مسکراہٹ سے اعضاء وجوارح کی حرکت سے اسلامی تعلیمات کے مژدۂ جاں فزا کی نوید بن جاتے ہیں۔

شیخ وصی اللہ عباس مدنی پہلے تو متوجہ ہوئے۔ پھر اُن کے ہونٹ تبسم ریز ہوئے اور آخر کار کھلکھلا کر ہنس پڑے: ''بھئی ڈاکٹر صاحب! آپ نے تو کمال کر دیا۔ اسے کہتے ہیں تفقہ فی الحدیث۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے تو شرحِ صدر پیدا کر دیا۔''

اور میزبان انجینئر سے مخاطب ہوئے: ''انجینئر صاحب! منتظمین کو میرا پیغام دیجیے۔ میں اس تشہیری پروگراموں کے لیے تیار ہوا ہوں۔ صحیح بات ہے یہ تبلیغ دین ہے۔ بشارت کی نوید ہے۔ مسکرا کر اپنے زائرین کا ہمیں استقبال کرنا ہے۔''

اسلامی بینکنگ کی اسلامیت

ایک عالم دین نے تصوف کے تئیں صحیح منہج کے بارے میں سوال کر دیا:

میں نے کہا: تصوف پر سلفی علماء سخت تنقید کرتے ہیں۔ تحریک اسلامی میں مولانا امین الاحسن اصلاحیؒ (۱۹۹۷-۱۹۰۴ء) صوفیاء کے تصورِ عشق میں آوارگی کی بُو محسوس کرتے تھے۔ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ (۱۹۹۸-۱۹۱۷ء) نے اپنی معروف کتاب ''قرآن کا تصورِ دین'' میں عشقِ تصوف اور محبتِ قرآنی میں واضح تضادات شمار کیے ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۷۹-۱۹۰۳ء) نے آغاز میں تصوف کو مسلمانوں کے لیے ''چنیاں بیگم'' قرار دیا تھا۔ بعد میں انھوں نے اسلامی تصوف اور غیر اسلامی تصوف میں فرق کیا۔ فلسفۂ تصوف کو جاہلیت کہا اور تعمیر سیرت اور تزکیہ کی تعلیمات کی تحسین کی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (۱۹۹۶-۱۹۱۴ء) نے اپنی تحریروں میں تصوف کی اصطلاح پر سخت اعتراض کیا اور اس اصطلاح کو غیر اسلامی تصورات واعمال کا محرک بتایا۔ ''احسان'' کی نبوی اصطلاح کو انھوں نے استعمال کرنے پر زور دیا۔ میاں طفیل محمدؒ (۲۰۰۹-۱۹۱۳ء) امیر جماعت پاکستان نے شیخ علی ہجویریؒ (۲/۷/۱۰۶۳-۱۰۱۰ء) کی معروفِ زمانہ کتاب کشف المحجوب کا ترجمہ کیا اور اس پر خوبصورت تصریحات کا اضافہ کیا۔

میں نے بتایا کہ راقم کا بھی ایک مقالہ برسوں پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں رابعہ العدویہؒ ۱۳۷ یا ۱۴۷ یا ۱۸۷ سے ۸۰۱ء)، شیخ علی ہجویریؒ اور شیخ احمد سرہندیؒ (۱۶۲۴-۱۵۶۴ء) کے افکار زیرِ بحث آئے ہیں اور غیر اسلامی تصوف پر اُن کی تنقیدیں شامل ہیں:

Islamic Critique of Sufism: A Study of Rabi'a, Hujwiri and Sirhindi, Jnanada Prakashan, New Delhi, 2014, 270 pp.

ایک نوجوان عالم دین نے پاکستان میں رائج اسلامک بینکنگ کے نظام کو غیر اسلامی بتایا کہ شریعت کی کما حقہ، ترجمانی اس نظام میں موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقیؒ (۲۰۲۲-۱۹۳۱ء) ڈاکٹر عمر چھابرا، ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ (۲۰۱۰-۱۹۵۰ء)، ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاریؒ (۲۰۱۶-۱۹۳۲ء) وغیرہ نے جو لٹریچر تیار کیا ہے اس کا مطالعہ کیجیے تو غیر سودی نظام معیشت کی جو تفصیلات قرآن وحدیث میں ملتی ہیں اُن کا بہت سے پہلوؤں سے فقدان نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد نے خود وضاحت کر دی کہ مفتی محمد تقی عثمانی نے صراحت کی ہے کہ یہ حکومتی اقدامات اسلامی بینکنگ کی مکمل ترجمانی نہیں کرتے ہاں اُس جانب صحیح سفر کا ایک سنگ میل ضرور ہیں۔ ہم ابھی عبوری مرحلہ سے گزر رہے ہیں۔ مزید اقدامات کی ضرورت ہے۔

بہاول پور میں پانچ دنوں کی اقامت، علمی وفکری تعامل نے دل پر گہرا نقش ثبت کیا۔ ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد نے شرافت ودیانت اور تعاون وتعامل کی روشن مثال قائم کی۔ دفتر مالیات کے شب وروز چکر لگائے۔ یونیورسٹی انتظامیہ کے گھروں کا طواف کیا۔ مختلف مسالک کے افراد وشخصیات سے فکر ومصاحبت کی تاکہ مجھے شکایت نہ ہو۔ میرے واجبات کی تعمیل میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ بہاول پور سے روانگی کے بعد بھی اخوت ویگانگت کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں ''شبیر'' ہیں اور ''ابوالحسن'' بھی ورنہ اکثر احباب اور رفاقت کا دم بھرنے والے ساتھیوں کا حال یہ ہے کہ تحسین اور قدر شناسی تو کجا، موقع ملتے ہی چوطرفہ یلغار شروع کر دیتے ہیں۔ حفیظ جالندھری کو کتنا تلخ تجربہ تھا زندگی کا۔ کہتے ہیں:

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

فضل الرحمن اصلاحی قاسمی *

اسلامی نقطۂ نظر سے توریت اور بائبل کی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے نظام کو چلانے کے لیے جہاں انسانوں کو ہر طرح کے اسباب مہیّا کیے، وہیں ان کی روحانی غذا اور رہ نمائی کے لیے کتابوں اور پیغمبروں کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اسی لیے ہر دور میں قرآن مجید کے علاوہ آسمانی کتابیں اور دیگر صحیفے نبیوں و رسولوں کو دیے گئے ہیں یہ سب آسمانی کتابوں میں شامل ہیں۔ یعنی یہ سب اللہ کی جانب سے نازل شدہ ہیں۔ کیونکہ اسلام کے بنیادی عقیدے میں یہ صراحت موجود ہے:

"آمنت باللّٰہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر والقدر خیرہ وشرہ من اللّٰہ تعالیٰ والبعث بعد الموت" [1]

ترجمہ: میں ایمان لایا اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر، اللہ کی جانب سے اچھی بری تقدیر پر اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر۔

درحقیقت مسلمانوں کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی اپنی نسبت حضرت ابراہیمؑ سے ہی جوڑتے

* معاون رفیق دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ای میل: islahi1980@gmail.com

ہیں۔ گویا ان تینوں کے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلا ہیں، جن کو مؤحد اعظم کہا جاتا ہے اور بعد میں اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) نے توحید، رسالت، آخرت اور وحی کے بارے میں اپنے عقائد میں بگاڑ پیدا کرلیا۔ اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق ہر دور میں قوموں کی ہدایت کے لیے انبیاء ورسل کو مبعوث کرتا رہا اور ان پر کتابیں نازل کیں۔ سابقہ الہامی کتابوں میں توریت، انجیل اور زبور وغیرہ، ان کی واضح مثالیں ہیں۔ یہ ساری کتابیں موجودہ بائبل کا مجموعہ کہلاتی ہیں اور قرآن مجید شاہد ہے کہ ان کے ماننے والوں ہی نے ان کتابوں میں تحریفات کردی ہیں۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ آیت: ۷۵ میں ہے:

أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُواْ لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلاَمَ اللّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ.

ترجمہ: کیا تم یہ امید رکھتے ہو کہ یہ یہود تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے، حالانکہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ وہ اللہ کا کلام سنتے تھے اور پھر اس کو بدل ڈالتے تھے سمجھنے کے بعد اور وہ جانتے ہیں۔

ایسے ہی سورۃ النساء آیت ۴۶ اور سورۃ المائدہ آیت ۱۲، ۴۱ کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ اہل کتاب نے ان میں تحریفات کرڈالیں۔ اس لیے ان کتابوں میں حق اور باطل گڈمڈ ہوگیا۔ ان میں کیا باتیں صحیح ہیں اور کیا غلط؟ اس کو جانچنے کے لیے قرآن مجید ہمارے لیے ایک میزان عدل اور کسوٹی ہے، کیوں کہ قرآن مجید کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ مہیمن بھی ہے، اس کے معنی ہیں نگہبان، نگراں، گواہ اور محافظ۔ یعنی آج بھی قرآن مجید سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ سابقہ آسمانی کتابوں میں کیا کیا تحریفات کی گئی ہیں اور کیا باتیں ان میں درست ہیں، جن کی تائید خود قرآن سے ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِناً عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ وَلاَ تَتَّبِعْ أَهْوَاءهُمْ عَمَّا جَاءكَ مِنَ الْحَقِّ. (سورۃ المائدۃ: ۴۸)

ترجمہ: اور ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری حق کے ساتھ، تصدیق کرنے والی پچھلی کتاب کی اور اس کے مضامین پر نگہبان۔ پس تم ان کے درمیان

فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

مولانا مودودیؒ لفظ مھیمن کی جامع تشریح ان الفاظ میں کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اصل میں لفظ مھیمن استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی محافظت، نگرانی، شہادت، تائید اور حمایت کے ہیں۔ پس قرآن کو 'الکتاب' 'المھیمن' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے تمام برحق تعلیمات کو جو پچھلی آسمانی کتابوں میں دی گئی ہیں اپنے اندر محفوظ کر دیا ہے۔ وہ ان پر نگہبان ہے، اس معنی میں کہ اب ان کی تعلیمات برحق کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے گا۔ وہ اس کا موید ہے اس معنی میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کا کلام جس حد تک موجود ہے، قرآن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ ان پر گواہ ہے اس معنی میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کا کلام اور لوگوں کے کلام کی آمیزش ہوگئی ہے، قرآن کی شہادت سے اس کو پھر چھانٹا جا سکتا ہے۔ وہ خدا کا کلام ہے اور جو قرآن کے خلاف ہے وہ لوگوں کا کلام''۔[۲]

اس قدر طویل تمہید کے بعد اب اصل موضوع پر گفتگو مرکوز کی جاتی ہے۔

قرآن کریم میں تورات وانجیل کا تذکرہ

قرآن کریم میں تورات وانجیل کا تذکرہ متعدد بار ہوا ہے۔ مثلاً آل عمران ۳، ۴۸، ۵۰، ۶۵، ۹۳، سورۃ المائدۃ: ۴۳، ۴۴، ۴۶، ۶۶، الاعراف: ۱۵۷، سورۃ التوبۃ: ۱۱۱، سورۃ الفتح: ۲۹، اور سورۃ الصّف: ۶ وغیرہ۔

ان آیات کا جائزہ لینے سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ یہ کتابیں تحریفات سے قبل سراپا ہدایت تھیں، اور قرآن مجید کے نزول بعد ان کی وہی باتیں قابل اعتبار سمجھی جائیں گی، جن کی تائید وتصدیق خود قرآن سے ہوتی ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدۃ: ۶۶ میں ہے:

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّون. (سورۃ

المائدہ:۴۴)

ترجمہ: بے شک ہم نے تورات اتاری ہے، جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔اسی کے مطابق انبیا علیہ السلام (یہودی لوگوں کا) فیصلہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن الاعظمیؒ لکھتے ہیں:

''....صرف اس کتاب کا نام تورات ہے، جس کا قرآن مجید میں بار بار ذکر آیا ہے اور اس نے کئی جگہ پر اشارہ کیا ہے کہ یہودی علماء نے تورات میں کس تحریف اور ردوبدل کا کام کیا۔لیکن اب بھی اس میں کلام الٰہی کے کچھ ٹکڑے موجود ہیں، جن کو قرآن مجید نے نور اور ہدایت کہا ہے''۔[۳]

انجیل یونانی لفظ ہے اس کے معنی اچھی خبر کے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انجیل کا ذکر سورۃ المائدۃ:۴۶ میں سراپا ہدایت اور نور سے کیا ہے۔

وَقَفَّيْنَا عَلَى آثَارِهِم بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الإِنجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ. (سورۃ المائدہ:۶۴)

ترجمہ: اور ہم نے ان کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو مبعوث کیا جو اپنے سے پہلے کی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرنے والے تھے اور ہم نے ان کو انجیل عطا کی، جس میں نور اور ہدایت ہے اور اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والی ہے اور اس میں ہدایت و نصیحت ہے ڈرنے والوں کے لیے۔

ان دونوں آسمانی کتابوں تورات اور انجیل کی پوزیشن واضح ہو جانے کے بعد اب قرآن مجید سے اولاً چند دلائل تحریفات تورات کے بارے میں پیش کیے جائیں گے اور اس کے دیگر مراجع کی روشنی میں اس پر بحث ہوگی۔

تحریفاتِ تورات قرآن مجید کی روشنی میں

تورات میں تحریف کب واقع ہوئی ہے؟ اس سوال سے قبل چند آیات کا مطالعہ مفید ہوگا:

انعام:۹۱، بقرہ:۷۹، مائدہ:۱۲-۱۴

سورۃ الانعام:۹۱ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہودیوں نے تورات کو ''قراطیس'' یعنی کورا کاغذ بنا دیا۔ لغت کے اعتبار سے قراطیس قرطاس کی جمع ہے، اس کے معنی لکھنا اور کورا ہے۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے ورقۃٌ اور صفحۃٌ کو چھوڑ کر قراطیس کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے یہ بات بتانا غالباً مقصود ہے کہ یہود کے نزدیک توریت کی حیثیت کورے کاغذ کی تھی۔ یہ لوگ تورات کے الگ الگ ورق ساتھ رکھتے تھے جو اوراق مطلب کے ہوتے ان کو یہ ظاہر کرتے اور بہتیرے اوراق جو ان کے مدعا کے خلاف ہوتے، انہیں چھپا دیتے تھے۔ چنانچہ اس پس منظر میں مذکورہ سورۃ الانعام کی آیت کا مطالعہ کریں۔

''قل من أنزل الكتاب الذی جاء به موسیٰ نورًا و هُدی تجعلونه قراطیس تبدونها و تخفون كثيرًا''.

ترجمہ: کہو کہ وہ کتاب کس نے اتاری تھی، جس کو لے کر موسیٰ آئے تھے، وہ روشن تھی اور رہنمائی تھی لوگوں کے واسطے، جس کو تم نے ورق ورق کر رکھا ہے، کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور بہت کچھ چھپاتے ہو۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا بدرالدین اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے تورات کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے اور ان کی اس شرارت کا منشا صرف یہ تھا کہ کتاب کا جو حصہ ان کے حق میں مفید ہو، اس کو ظاہر کریں اور جو حصہ مضر ہو یا جس سے کسی نفع کی توقع نہ ہو، اس کو چھپا دیں، یہود کی یہ عادت عام تھی۔ قرآن مجید نے ان کی اس شرارت کو بار بار بیان فرمایا ہے۔ وہ آیات الٰہی کی تجارت کرتے تھے، اس لیے قدرتی طور پر وہ چیز سامنے لاتے تھے جس کی مانگ ہو اور ان کے لیے نفع بخش تجارت ہو سکے، پوری تورات کو ظاہر کرنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ چنانچہ آنحضورؐ نے بھی جس وقت تورات طلب فرمائی تو انہوں نے صرف چند اوراق پیش کیے، پوری

کتاب سامنے نہ لائے''۔[۴]

قرآن مجید سے تحریف کے ان واضح واقعات کے بعد اب اس سوال کا جواب پیش ہے، کہ ان آسمانی کتابوں میں کب تحریف کی گئی۔

تحریف کب واقع ہوئی؟

اس سوال کا حتمی جواب دینا مشکل ہے، جیسا کہ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''اظہار الحق'' میں ایک ذیلی عنوان قائم کیا ہے ''**من تحریف التوراۃ و الانجیل**''۔

مولانا کیرانویؒ کی تحقیق کے مطابق جب تورات کا نسخہ متعدد بار گم ہو گیا اور خاص طور سے جب بخت نصر نے ہیکل کو نذر آتش کر دیا اور یہودیوں کو بابل میں قید کر دیا گیا تھا، اس وقت زیادہ امکان ہے کہ تحریف کا آغاز ہوا۔ مولانا کیرانویؒ کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ کریں:

> **''تحریف التوراۃ و الانجیل مر بمراحل متعددۃ و ادوار متعاقبۃ یصعب منھا القطع بتاریخ معیّن لبدایۃ ذلک التحریف و لکن یمکن القول بأن التحریف بدأ بعد ان فقدت التوراۃ عدۃ مرّات نتیجۃ لما تعرض لھا الیھود من غزو و تدمیر و لاسیما بعد ان حرق بختنصر الھیکل و سبی الیھود الی بابل.... وفی ھذہ الحادثۃ انعدمت التوراۃ و سائر کتب العھد العتیق عن صفحۃ العالم رأسا، و لما کتب عزرا ھذہ الکتب علی زعمھم ضاعت نسخھا و اکثر نقولھا فی حادثہ انتکوس''.** [۵]
>
> ترجمہ: تورات اور انجیل میں متعدد دفعہ مرحلہ اور تحریف واقع ہوئی ہے، لیکن اس عمل کا آغاز کب ہوا، اس سلسلے میں کوئی حتمی تاریخ متعین کرنا ایک مشکل امر ہے، لیکن اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس وقت تورات میں تحریف کا آغاز ہوا ہوگا جب تورات کے نسخے متعدد دفعہ مفقود ہو گئے کیونکہ قوم یہود

پر لشکر کشی اور انھیں اجاڑنے کے لیے ان پر حملے ہوئے اور بخت نصر نے ہیکل کو آگ لگادی اور اس نے بابل کی طرف یہود کو جلاوطن کر دیا، اس حادثے کے نتیجے میں تورات اور عہد قدیم کی ساری کتابیں صفحۂ عالم سے معدوم ہوگئیں۔ اور جب حضرت عزیر نے ان کتابوں کو لکھا ان یہودیوں کے گمان کے مطابق، تو اس وقت ان کتابوں کے سارے ہی نسخے اور اس کی اکثر نقلیں حادثۂ 'انتکوس' کے موقع پر ضائع ہوگئیں۔

تحریف توریت کے متعلق ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن الاعظمی رحمہ اللہ اپنی معروف کتاب "**دراسات فی الیھودیة والمسیحیة وادیان الھند**" میں لکھتے ہیں:

"**وعندما أعاد اليهود كتابة التوراة أدخلوا فيها ما ليس منها من ميولهم ونزعاتهم، وما اشربوا في قلوبهم من وثنية ورثوها من الأمم التي خالطوها وأساء واعلى الله أبلغ الاسائة ونعتوه بما لا يليق بذاته وصفاته....**"[۲]

ترجمہ: جب یہودیوں نے تورات کی کتابت کا اعادہ کیا تو اس وقت اس میں بہت سے اپنے ذہنی میلانات ورجحانات اور نزاعی باتوں کو داخل کر دیا اور ان کے دلوں میں جو بت پرستی کی محبت راسخ ہوگئی، یہ انھیں دیگر قوموں کے اختلاط کے نتیجے میں وارثۃً ملی تھی اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں انھوں نے حد درجہ گستاخی کی اور اس کی ایسی تعریف کی جو اس کی ذات وصفات کے لائق نہیں تھی۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جب یہودیوں کے یہاں بت پرستی پیدا ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہر طرح کے مشرکانہ عقائد ایجاد کر لیے اس وقت ان لوگوں نے توراۃ میں تحریف کر لی۔

حقیقت میں یہودی تورات کے باب میں تمام طرح کی تحریفات کا شکار ہوئے جیسا کہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اپنی مشہور کتاب "یہود اور قرآن مجید" میں شہرستانی کے حوالے سے لکھا ہے:

"انہوں نے الفاظ کی لکھاوٹ اور صورت میں بھی تحریف وترمیم کی تھی اور

ان کی تاویل وتفسیر میں بھی‘‘ ۷

اس موضوع پر مولانا اصلاحیؒ کا مطالعہ بڑا عمیق معلوم ہوتا ہے، وہ تحریفِ تورات کے سلسلے میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توریت کو مرتب کرا کے جس تابوت میں رکھوایا تھا وہ اور تورات کے تمام نسخے چھٹی صدی قبل مسیح میں بخت نصر کے حملے میں بیت المقدس میں جل کر خاکستر ہو گئے۔ اس واقعہ کے دوصدی بعد حضرت عزیر علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے کاہنوں اور لاویوں کے تعاون سے اس کو از سر نو مرتب کیا۔ مولانا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ’’ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں تورات کے اصل الفاظ باقی نہیں رہے تھے، بلکہ یادداشت سے مفہوم لکھ دیا گیا تھا، مگر حوادث روزگار نے اس نسخہ کو بھی اپنی اصلی صورت پر باقی نہ رہنے دیا۔ سکندر اعظم کی عالم گیر فتوحات کے زمانہ میں جب یونانی علوم وفنون کی ترقی ہوئی تو ۲۸۰ قبل مسیح میں تورات کی تمام کتابیں یونانی زبان میں منتقل کر دی گئیں اور رفتہ رفتہ اصل عبرانی نسخہ کا رواج باقی نہ رہا اور اس کے بجائے یونانی ترجمہ اور اس کے ترجمے دنیا میں رائج ہو گئے۔ اس حالت میں تورات کی جو شکل رہ گئی تھی وہ بھی علمائے یہود کی تحریفات اور تصرفات کا سراسر نشانہ بنی رہی‘‘۔ ۸

اس کے بعد تحریف انجیل کا قضیہ ملاحظہ کریں:

تحریف انجیل کب واقع ہوئی؟

اس قضیہ کے موافق ومخالف اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو تورات نازل ہوئی تھی اب دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی ہے۔ بلکہ متعدد انجیل کے نسخے جو پائے جاتے ہیں، یہ اناجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تلامذہ اور ان کے متعلقین کی یادداشت ہے۔ مولانا کیرانویؒ کی تحقیق کے مطابق عیسائیوں پر بڑی بڑی آزمائشیں تیسری صدی عیسوی میں آئیں اور اس بنا پر وہ اصل انجیل سے ہاتھ دھو بیٹھے، کیوں کہ ان کے مختلف فرقوں کے درمیان اس بات کو لے کر شدید اختلاف رونما ہوئے۔ مولانا کیرانوی کی عبارت کے الفاظ درج ذیل ہیں:

وانه فقد بسبب تحريف الفرق النصرانية او بسبب الفتن العظيمة التى مرت على النصارى فى القرون الثلاثة الاولىٰ واما نسخة انجيل متى الموجودة باللغة العبرانية فهى مترجمة عن الترجمة اليونانية ولا يوجد عندهم سند هذه الترجمة ولا احواله كما اعترف به جيروم ولكنهم يقولون بالظن : لعل فلاناً او فلاناً ترجمه، وبمثل هذا الظن لا يثبت استناد الكتاب الىٰ مصنفه". [۹]

ترجمہ: اور یہ چیز کہ تحریف کب واقع ہوئی؟ مفقود ہے کہ عیسائیوں کے فرقہ کی فرقے کی تحریف کے سبب یا ان بڑے بڑے فتنے کے سبب جو تیسری صدی میں ان عیسائیوں پر گزرے ہیں اور رہا انجیل کا وہ نسخہ جو عبرانی زبان میں پایا جاتا ہے۔ وہ یوناتی ترجمے کا ترجمہ ہے، اور اس ترجمے کی کوئی سند ان کے پاس نہیں ہے اور نہ اس ترجمے کے حالات کچھ معلوم ہیں، جیسا کہ 'جیروم' نے خود اعتراف کیا ہے اور یہ لوگ محض اپنے ظن کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ یہ ترجمہ فلاں کا ہوگا یا فلاں نے کیا ہوگا، اور اس گمان کے مثل یہ باتیں کرتے ہیں۔ اس کتاب کی نسبت اس کے مصنف کی طرف کرنا ثابت نہیں ہے۔

قرآنی انسائیکلوپیڈیا کے مصنف ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن الاعظمیؒ کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد اصل انجیل کو اٹھا لیا گیا، آج جو اناجیل کے نام سے کتابیں پائی جاتی ہیں ہم ان کو یسوع کی سوانح حیات مان سکتے ہیں۔ آگے قاموس کتاب مقدس کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ ''یہ انجیلیں یسوع کے شاگردوں کی تالیف ہیں، جن میں یسوع کی زندگی کا خاکہ بیان کیا گیا ہے۔ دیکھیے لفظ انجیل: ۱۲۱)

ایک دوسرے مقام پر ہے۔ ان انجیلوں میں خاص طور سے یسوع کی موت اور قبر سے اٹھائے جانے کا تذکرہ ہے۔ (لفظ انجیل: ۱۲۰)

آگے چند سطروں کے بعد ان کا یہ تبصرہ بڑا معنی خیز معلوم ہوتا ہے:

''اس سے اچھی طرح وضاحت ہو جاتی ہے کہ موجودہ اناجیل وہ انجیل نہیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام پر اتارا تھا اور جس کی تبلیغ خود عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواری کیا کرتے تھے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ انجیل آخر کہاں گئی؟ اس لیے اب یہ کام نصاریٰ اور مسلمان علماء کا ہے کہ وہ اس کو تلاش کریں''۔ [۱۰]

راقم کے خیال میں جب قرآن نازل ہو رہا تھا، اس وقت تک انجیل میں بھی بہت سے احکام قابل عمل تھے۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے نصاریٰ کو اس انداز سے مخاطب کیا ہے:

وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الإِنجِيْلِ بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فِيْهِ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْفَاسِقُون. (المائدہ:۴۷)

ترجمہ: اور انجیل والوں (نصاریٰ) کو چاہیے کہ اس کے مطابق فیصلہ کریں، جسے اللہ تعالیٰ نے انجیل میں نازل فرمایا ہے اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرے گا جو اللہ نے اتارا ہے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

اسی طرح موریس بوکائے جن کا مطالعہ قرآن، بائبل، سائنس پر بڑا گہرا تھا، اپنی معروف کتاب بائبل، قرآن اور سائنس میں تحریف انجیل کے بارے میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

''غزہ سے انطاکیہ تک شامی فلسطینی ساحل پر یہودی اور عیسائیت کا غلبہ تھا، جیسا کہ رسولوں کے اعمال اور کلیسی تحریروں سے شہادت ملتی ہے۔ ایشائے کوچک میں یہودیت اور عیسائیت کا وجود تھا جیسا کہ سینٹ پال کے خطوط بنام گلتیوں اور کلیسوں سے ظاہر ہوتا ہے ... یونان میں پال کے کورنتھیوں کے نام پہلے خط میں یہودیت و عیسائیت کا حوالہ ملتا ہے''۔ [۱۱]

عیسائیت میں پال کے اثر و رسوخ اور دراندازی کے فوراً بعد ہی انجیل میں تحریف واقع ہوئی ہوگی جیسا کہ مذکورہ بالا پیراگراف سے بھی یہی نتیجہ مترشح ہوتا ہے۔ اسی طرح تحریف انجیل کے تعلق سے بائبل، قرآن اور سائنس کے مصنف کا یہ نتیجہ بھی قابلِ مطالعہ معلوم ہوتا ہے:

''وہ متون جو اصل مأخذوں میں متعدد تصرفات کے بعد اس وقت موجود ہیں، ۷۰ء کے لگ بھگ وجود میں آنے شروع ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دونوں حریف قومیں ایک شدید قسم کی آویزش میں مشغول تھیں جس میں یہودو عیسائیت کو اس وقت بھی غلبہ حاصل تھا۔ جنگ، یہود اور ۷۰ء میں سقوط یروشلم کے ساتھ ہی حالت الٹ گئی تھی''۔[۱۲]

توریت اور انجیل میں کس نوعیت کی تحریف واقع ہوئی اور اس کی چند متعینہ مثالیں کیا ہیں، اب ان دونوں شقوں پر گفتگو کا مرحلہ ہے۔ پہلے تحریف کی نوعیت اور پھر اس کی متعین مثالیں پیش کی جائیں گی۔

تحریف کی نوعیت

اس سلسلے میں قرآن کریم ہماری رہنمائی اس انداز میں کرتا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَـذَا مِنْ عِندِ اللّهِ لِيَشْتَرُواْ بِهِ ثَمَناً قَلِيلاً فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ. (بقرہ:۷۹)

ترجمہ: پس افسوس ہے ان لوگوں پر جو اپنے ہاتھوں سے تو کتاب لکھیں پھر (لوگوں سے) کہیں کہ یہ خدا کے یہاں سے (اتری) ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ سے تھوڑے سے دام حاصل کریں، پس افسوس ہے ان پر کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور (پھر) افسوس ہے ان پر کہ وہ ایسی کمائی کرتے ہیں۔

اس کے بعد سورۃ المائدۃ: ۱۲۰ کا بھی مطالعہ مفید ہوگا:

"یحرفون الکلم عن مواضعه...."

لفظوں کو ان کی جگہ سے پھیرتے ہیں اور ان کو جو نصیحت کی گئی تھی، اس میں سے ایک بڑا حصہ بھلا بیٹھے اور (اے) پیغمبر اب ان کا یہ حال ہو گیا ہے کہ ان میں سے چند لوگوں کے سوا سب کی (کسی نہ

کسی) چوری کی اطلاع تم کو ہوتی ہی رہتی ہے۔

ان دونوں آیتوں کے مطالعہ سے تحریف کی نوعیت بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ یہودیوں نے اپنی کتابوں میں بہت سی نئی نئی باتیں دنیاوی مفاد کی خاطر اپنے ہاتھ سے لکھ کر داخل کر دی تھیں اور ان لوگوں نے لفظوں میں تحریف کی تھی اور کتاب کے ایک معتد بہ حصے کو اپنی بے پروائی اور قلت اعتناء کی وجہ سے فراموش کر دیا تھا۔

تحریف یہودیوں کی انتہائی اہم شرارت ہے، اس لیے اس پر ذرا بغور نظر ڈالنی چاہیے۔ یہ کہ کتب آسمانی میں تحریف کی جو بھی شکلیں ہو سکتی تھیں، ان کے صحیفوں میں موجود ہیں اور قرآن مجید نے ان قسموں کو کھول کر بیان فرمایا ہے۔ مولانا بدرالدین اصلاحیؒ کا درج ذیل اقتباس تحریف کی نوعیت پر خاص روشنی ڈالتا ہے:

''تحریف کے کیا معنی ہیں؟ تحریف حرف سے مشتق ہے اور حرف کہتے ہیں طرف (کنارا) کو۔ پس تحریف کے معنی ہوئے کسی چیز کو اس کے صحیح رخ کی طرف سے دوسرے رخ کی تحویل میں کر دینا۔ تحریف کی دو قسمیں ہیں: تحریف معنوی، تحریف لفظی۔ پھر یہیں سے تحریف کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں: تحریف کلمہ، تحریف عبارت تحریف معنوی ظاہر ہے لفظوں کو اپنی جگہ پر باقی رکھ کر معانی میں ردوبدل کرنے کا نام تحریف معنوی ہے۔ تحریف لفظی کے یہ معنی ہیں کہ کسی لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا جائے جو تلفظ میں یا کتابت میں پہلے لفظ کے مشابہ ہو اور تحریف عبارت کا یہ مطلب ہے کہ عبارتوں کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ پر اس طرح مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم بنا کر رکھ دیا جائے کہ ''کتمان حق'' (حق کو چھپانا) کا مقصود حاصل ہو جائے''۔ [۱۳]

تحریف کی ان تفصیلی شکلوں کو جان لینے کے بعد اب تحریف کی متعدد متعینہ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

تحریف کے چند قرآنی دلائل

پہلے ایک مثال قرآن سے دینا مناسب ہوگا۔ سورۃ النساء: ۴۶ میں ہے:

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا

وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيّاً بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْناً فِي الدِّيْنِ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُواْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانظُرْنَا لَكَانَ خَيْراً لَّهُمْ وَأَقْوَمَ . (سورۃ النساء:۴۶)

ترجمہ: یہود میں سے ایک گروہ بات کو اس ٹھکانے سے ہٹا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نے سنا اور نہ مانا۔ اور کہتے ہیں کہ سنو اور تمھیں سنوایا نہ جائے۔ وہ اپنی زبان کو موڑ کر کہتے ہیں، راعنا، دین میں عیب لگانے کے لیے۔ اور وہ اگر کہتے کہ ہم نے سنا اور مانا اور سنو اور ہم پر نظر کرو تو یہ ان کے حق میں زیادہ بہتر اور درست ہوتا۔

مذکورہ آیت سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ کس چالاکی اور شاطرانہ مزاج سے **قَالُواْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا** کے بجائے **سمعنا وعصینا** کہا کرتے تھے۔

قرآن مجید سے ایک دوسری مثال پیش کی جاتی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے متعلق ہے۔ قرآن مجید اور انجیل کے موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انجیل میں تحریف کی گئی ہے۔ سورہ تحریم: ۱۲ میں ہے:

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِن رُّوحِنَا.

ترجمہ: اور عمران کی بیٹی مریم، جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی، پھر ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی۔

انجیل یوحنا اور انجیل مرقس میلاد عیسیٰ کے واقعہ سے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ انجیل متی اور لوقا میں اس کا تذکرہ افسانوی رنگ میں کیا گیا ہے۔ انجیل لوقا باب (۱) کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

''جبرئیل فرشتہ ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف سے ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا، فرشتے نے آ کر اس کو سلام کیا اور کہا اے مریم! تو حاملہ ہوگئی اور بیٹا جنے گی۔ اس کا نام یسوع رکھنا وہ بزرگ ہوگا اور خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلائے گا''۔ [۱۴]

اوراس واقعہ کوانجیل متیٰ باب(۱) میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''جب مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوگئی تو ان کے اکٹھا ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ ہوگئی، پس اس کے شوہر نے جوایک راست باز تھااوراسے بدنام کرنانہیں چاہتا تھا، چپکے سے اس کوچھوڑ دینے کا وعدہ کیا تو فرشتے نے اسے خواب میں دکھایا۔اے یوسف! اپنی بیوی مریم کواپنے یہاں لانے سے مت ڈر۔وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ ہوئی ہے اور بیٹا جنے گی اور وہ لوگوں کوان کے گناہوں سے نجات دے گا''۔ [۱۵]

حضرت مریم علیہا السلام کے اس واقعہ کوسورۃ التحریم کے علاوہ سورۃ المومنون میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔لیکن کہیں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ ان کا کوئی شوہر بھی تھا، اس کا نام یوسف تھا اور وہ بچہ خدا کا بیٹا ہوگا، نیز گناہوں سے نجات دلائے گا۔

قرآن کی صداقت اوران کتابوں کی تحریفات کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اللہ کے ایک کرشمہ کوافسانہ بنادیا۔کیا حضرت آدم علیہ السلام بغیر ماں باپ کے پیدا نہیں ہوئے تھے۔تو اللہ تعالیٰ کے لیے کیا بعید تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوبغیر باپ کے پیدا کرے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيْسَى عِندَ اللّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثِمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ. (سورہ آلِ عمران:۵۹)

ترجمہ: بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدمی کی سی ہے۔اللہ نے اس کومٹی سے بنایا۔پھراس کوکہا کہ ہوجاتو وہ ہوگیا۔

اس واقعہ کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا نعمت اللہ اعظمی حفظہ اللہ استاذ دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

''چوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت صرف ماں کے ذریعہ ہوئی تھی اورخدا کی طرف سے معجزانہ صورت میں یعنی باپ کے بغیر پیدائش کی بات حیرت واستعجاب کا سبب تھی۔اس لیے انجیل میں استعجاب کودور کرنے کے لیے یوسف سے ان کی منگیتر ہونے کی بات بنائی گئی تا کہ عوامی سطح پر یہ

پیدائش حیرت کا سبب نہ رہے۔البتہ اس صورت میں یہ واقعہ یوسف کے
لیے بڑی پریشانی اور اضطراب کا سبب بنتا ہے اس لیے کہ اس کو مطمئن
کرنے کے لیے...بشارتوں کا سہارالیا گیا''۔ [۱۶]

قرآن مجید کی ان دونوں روشن مثالوں کے بعد اب تحریف کی چند مثالیں ''اظہار الحق'' کے ایک باب **''بیان ان هذه الکتب مملوء ة من الاختلافات و الاغلاط و التحریفات''** سے پیش کی جارہی ہیں۔

چونکہ مقالہ میں صرف تحریف کی نوعیت زیر بحث ہے، اس لیے چند مثالیں اس کی بھی پیش کی جارہی ہیں:

پہلی مثال: **''التعریف فی مدة اعمار الأکابر مثل الطوفان''** کی ہے۔

پہلی مثال یہ ہے کہ طوفانِ نوح کی طرح اکابر کی عمروں کی مدت کے بارے میں تحریف پائی جاتی ہے۔

> **''وردت مـــدة الزمان من خلق آدم الی طوفان نوح فی سفر التکوین ۵/۳۲-۱، وهی الفقرات التی وردت فیها مدة أعمار الاکابر الف بین بین آدم ونوح علیهما السلام، ومدة هذا الزمان علی حسب نسخة التوراة السامریة (۱۳۰۷) سنین، وعلی حسب نسخة التوراة العبرانیة (۱۶۵۶) سنة، وعلی حسب نسخة التوراة الیونانیة (۲۲۶۲) سنة، ویلاحظ فرق کبیر فی هذه المدة بین النسخ الثلاث بحیث لا تمکن المطابق? بینها''.** [۱۷]
>
> ترجمہ: سفر تکوین (۱/۵-۳۲) میں ہے آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان کتنی مدت رہی ہوگی۔اس بارے میں شدید اختلاف انجیل اور تورات کے متعدد نسخوں میں پایا جاتا ہے اور وہ فقرے جو کہ اکابر کی مدت کے بارے میں آئے ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ آدم علیہ السلام اور نوح کے

درمیان ایک ہزار سال کا فرق ہے اور اسی زمانے کی مدت تورات کے سامری نسخے میں ۱۳۰۷ سال، تورات کے عبرانی نسخے میں ۱۶۵۶ سال اور تورات کے یونانی نسخے میں ۲۲۶۲ سال ہے۔

اس مدت کی تعیین میں ان تین نسخوں کے درمیان بہت زیادہ فرق ملاحظہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ان کے درمیان مطابقت ممکن ہی نہیں ہے۔

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی واقعہ کو تین نسخوں میں سیکڑوں سال کے فرق کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر تحریف کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے؟

درج ذیل اقتباس سے اس تحریف کا اندازہ لگائیں:

"وردت مـــدة الزمان من طوفان نوح الی ولادة ابراهیم فی سفر التکوین ۱۱/۲۶-۱۰، وهی الفقرات التی وردت فیها مدّة أعمار الأکابر الذین بین نوح وابراهیم علیهما السلام، ومدّة هـذا الزمان علیٰ حسب نسخة التوراة العبرانیة (۲۹۲) سنة، وعلـی حسـب نسـخة التوراة السامریة (۹۴۲) سنة، وعلی حسب نسـخة التوراة الیونانیة (۱۰۷۲) سـنة و یلاحظ فرق کبیـر فـی هـذه الـمـدة بیـن الـنسخ الثلاث بحیث لا تمکن الـمـطـابـقة بینهما، وقد اتفقت النسخ الثلاث علیٰ ان نوحا عاش بعد الطوفان (۳۵۰) سنة (سفر التکوین ۹/۲۸)." [۱۸]

ترجمہ: سفر تکوین (۱۱/۱۰-۲۶) میں ہے نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے درمیان کتنی مدت رہی ہوگی۔ اس بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ فقرے جو کہ اکابر کی عمروں کی مدت کے بارے میں آئے ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے درمیان عبرانی نسخے میں ۲۹۲ سال، تورات کے سامری نسخے میں ۹۴۲ سال اور تورات کے یونانی نسخے میں ۱۰۷۲ سال ہے۔ ان مدتوں کی تعیین میں ان

تین نسخوں کے درمیان بہت زیادہ فرق ملاحظہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس طور پر ان کے درمیان مطابقت ممکن ہی نہیں ہے اور ان تین نسخوں میں اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ نوح علیہ السلام طوفانِ نوح کے بعد ۳۵۰ سال زندہ رہے۔ (سفر تکوین: ۹/۲۸)

مذکورہ اقتباس سے تحریف فاحش بالکل ظاہر ہوگئی کہ ایک ہی واقعہ نسخہ عبرانیہ میں الگ سن کے ساتھ، تورات سامریہ میں الگ اور تورات یونانیہ میں الگ سن کے ساتھ اندراج کیا گیا ہے۔ اس طرح تینوں نسخوں میں اتنا بڑا فرق ہے کہ ان کے درمیان مطابقت ممکن نہیں ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اہل کتاب نے تحریف میں کیا کیا قلابازیاں کھائی ہیں۔

اس کے بعد تیسری مثال ملاحظہ ہو:

"**التحریف فی اسم الجبل المخصص لنصب الحجارة**" یعنی وہ پتھر کی لوح کب اور کہاں نصب کی گئی تھی، جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے لیے وصیت مرقوم تھی۔ اس سلسلے میں توراۃ کے نسخوں میں کافی اختلافات رونما ہوگئے ہیں۔ نسخۂ عبرانیہ میں ہے کہ جب تم لوگ اردن کو پار کرنا تو اس پتھر کو "جبل عیبال" پر اس وصیت نامہ کو چونے پتھر سے مضبوط کر کے نصب کر دینا اور توراۃ کے دوسرے نسخوں میں "جبل جرزّیم" پر نصب کرنے کی بات ملتی ہے۔

اس سلسلے میں شیخ کیرانوی کی تحقیق ملاحظہ کریں:

"**ففی سفر التثنیة ۴/۲۷ فی النسخة العبرانیة (حین تعبرون الاردن تقیمون هذه الحجارة التی انا اوصیکم لها الیوم فی جبل عیبال وتکلسها بالکلس)**".

"**وهذه الفقرة وردت فی التوراة السامریة کما یلی: (ویکون عند عبورکم الاردن تقیمون الحجارة هذه اللتی انا موصیکم الیوم فی جبل جرزّیم وتشیدها بشید)**". [۱۹]

ترجمہ: سفر تثنیہ ۴/۲۷ عبرانی نسخے میں ہے، جس وقت تم لوگ اردن کو پار کروگے تم انھیں پتھروں پر قیام کرنا۔ یہی آج میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں

یعنی اسی عیبال پہاڑ پر تم لوگ قیام کرو اور اس پر پہاڑ پر چونا کرو۔ یہی فقرہ تورات سامریہ کے نسخے میں آیا ہوا ہے جیسا کہ اس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں: **و یکون عند عبورکم الاردن تقیمون الحجارۃ ھذہ اللتی انامو صیکم الیوم فی جبل جرزّیم و تشیدھا بشید.**

تحریف کی چوتھی مثال توریت کے سلسلے میں یہ ہے کہ موجودہ تورات جو اس وقت مروج ہے وہ موسیٰ علیہ السلام کے انتقال کے بعد لکھی گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس میں یہ لکھا گیا ہے کہ طالوت بنی اسرائیل کے پہلے بادشاہ ہیں اور ان کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ۳۵۶ سال کے بعد کا ہے۔ لیکن اس بات میں کوئی مناسبت قطعی طور سے نہیں پائی جاتی۔ مولانا کیرانویؒ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"لأنھا تدلّ علیٰ ان المتکلم بھا موجود بعد زمن قیام سلطنۃ بنی اسرائیل فی فلسطین، و کان اوّل ملوکھم طالوت، (شاول) و کان ھذا بعد موسیٰ علیہ السلام ب (۳۵۶) سنۃ، لکن لا مناسبۃ بتاتا لوجود ھذہ الفقرات فی سفر التکوین الذی ھو اول اسفار التوراۃ، فکیف دخلت فی المتن؟". [۲۰]

ترجمہ: یہ بات اس بات پر دلیل ہے کہ اس بات کا کہنے والا فلسطین میں بنی اسرائیل کی حکومت کے قیام کے زمانے کے بعد بھی موجود تھا۔ اور ان کا پہلا بادشاہ طالوت (شاول) تھا اور ان کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ۳۵۶ سال کے بعد کا ہے۔ لیکن قطعی طور میں اس میں کوئی مناسبت نہیں پائی اور یہ بات 'سفر تکوین اول اسفار' میں موجود ہے۔ پس یہ بات کیسے متن میں داخل ہوگی؟

یہ چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں ورنہ ان کتابوں کے جتنے نسخے ہیں، ان کے جائزہ کے بعد یہی تاثر سامنے آتا ہے۔ ع

غلطیہائے مضامین نہ پوچھ!

تحریف کے چند تاریخی دلائل

اب چند دلائل تاریخ سے بھی پیش کیے جارہے، جس سے تحریفات کی اصلیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔:

مولانا نعمت اللہ اعظمی نے 'ڈاکٹر مل اور مسٹر جان جیمس' کے حوالے سے چونکا دینے والے بعض ''انکشافات'' تحریف کے سلسلے میں نقل کیے ہیں۔ چنانچہ مولانا اعظمی لکھتے ہیں:

> ''کلیسا کے انتخاب کے بعد بھی ان میں ہر طرح کی تحریف لفظی ہوتی رہی۔ مسیحی علماء نے عہد نامہ جدید کے متن کی تصحیح کے لیے جان توڑ کوشش کی، جس سے امید تھی کہ ہمیشہ کے لیے ایک متن پر اتفاق ہو جائے گا، مگر نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔ ڈاکٹر مل نے عہد نامہ جدید کے متعدد نسخے جمع کر کے مقابلہ کیا تو تیس ہزار اختلافات شمار کیے، جان جیمس وغیرہ نے مختلف ملکوں میں پھر کر متقدمین کی بہ نسبت بہت زیادہ نسخے خود دیکھے اور جب مقابلہ کیا تو یہ اختلافات دس لاکھ تک پہنچ گئے...مگر اتنی بات قطعی ہے کہ انجیل میں تحریف ہوئی اور مسیحیت کے ہر لمحہ ہونے والے رویے اور مزاج نے نوشتوں کو ہر مرحلہ میں متاثر کیا ہے''۔ [۲۱]

پروفیسر ساجد میر صاحب نے ایک کتاب ''عیسائیت تجزیہ ومطالعہ'' لکھی ہے جو اپنے موضوع پر ایک تحقیقی اور مستند کتاب ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے اردو، عربی اور انگلش تینوں زبانوں میں شائع کیا گیا۔ پروفیسر ساجد میر نے اپنے تجزیہ میں تحریف کے متعلق یہ لکھا ہے:

> ''فی الحقیقت موجودہ بائبل کے عہد قدیم وجدید دونوں میں اتنی کثرت سے غلطیاں، تضادات، تبدیلیاں اور تناقضات پائے جاتے ہیں کہ انہیں ایک باب میں منحصر کرنا ممکن نہیں۔ یہ غلطیاں اور تناقصات بائبل میں تبدیلی وتحریف کی کھلی شہادت دیتے ہیں''۔ [۲۲]

پروفیسر ساجد میر صاحب نے انگریزی مراجع سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور تحریف کی بہت

سی مثالیں بڑی تفصیل سے پیش کی ہیں۔ان میں سے بعض کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱- بائبل کی پہلی کتاب پیدائش کے پہلے دو بابوں میں تخلیق آدم اور ابتدائے آفرینش کے بارے میں دو مختلف بیانات ہیں۔ان کے درمیان تطبیق دینا ناممکن ہے، کیوں کہ دونوں کے درمیان مواد اور طرز تحریر (Style of Matter) کے واضح اختلافات پائے جاتے ہیں۔دونوں ابواب کے مطالعہ سے ہر کھلے ذہن کا قاری اس نتیجہ پر پہنچتا ہے:

"One story tells that man was created before the animals, while an other tells us that the animals were created before man" [۲۳]

یعنی ایک کہانی بتاتی ہے کہ انسان کی تخلیق جانوروں سے مقدم ہے اور دوسری کہانی بتاتی ہے کہ جانوروں کی تخلیق انسانوں پر مقدم ہے۔اسی طرح تحریف کے چند اور دلائل انسائیکلوپیڈیا کے حوالے سے پیش کیے جارہے ہیں:

چنانچہ اس کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"The concept of that has very little in common with any of the Gospels" [۲۴]

ترجمہ: یوحنا کی انجیل میں بہت کم چیزیں دوسری انجیلوں کے ساتھ مشترک ہیں۔

یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ انجیل یوحنا سب سے الگ ہے۔اس لیے ایک مسیحی فاضلہ نے یہاں تک اس کے بارے میں لکھا ہے:

"The breack between the Jews and Christians was, by the time that has Gospel was written, complete and believed to be irreparable" [۲۵]

یعنی یہ انجیل لکھی گئی تو یہودیوں اور عیسائیوں میں تفریق مکمل ہو چکی تھی اور سمجھا جاتا تھا کہ اب یہ (تفریق) ناقابل تنسیخ ہے۔

تحریف کے چند سائنسی دلائل

تحریف کے ان چند تاریخی حوالوں کے بعد اب تحریف کے چند سائنسی دلائل پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ہر طرح کی تحریفات کا اندازہ ہو سکے۔ مثلاً آج سائنس کی تحقیق کے مطابق دنیا کی تخلیق ۳۷ یا ۳۸ صدی قبل ہوئی تھی لیکن بائبل اس سے قبل روئے زمین پر انسانی آبادی کی بات کرتی ہے جو درایۃً آج کے اعتبار سے ایک غلط مفروضہ ثابت ہو گیا ہے، چنانچہ موریس بکائے تحریر کرتے ہیں:

''ہمارے زمانہ اور عہد میں یہ جاننے کے لیے متبحر عالم ہونے کی ضرورت نہیں کہ دنیا کی تخلیق ۳۷ یا ۳۸ صدی قبل ہوئی تھی۔ ہمیں معلوم ہے کہ انسان کا ظہور اس وقت نہیں ہوا تھا اور باطل کے نسب نامے جن پر اس اندازے اور تخمینے کا انحصار ہے، بغیر کسی شک وشبہ کے غلط ثابت ہو گئے ہیں''۔ [۲۶]

ان چند اقباسات سے حق بالکل واضح ہو گیا ہے۔ مروجہ بائبل اگر واقعی الہامی کتاب ہوتی تو اس کے متون میں سائنسی اعتبار سے اتنے اغلاط نہ پائے جاتے بلکہ دونوں میں بہت حد تک مطابقت پائی جاتی، جیسا کہ قرآن مجید کے کسی نظریہ کو سائنس آج تک غلط قرار نہ دے سکی۔ بلکہ سائنس نے مزید اس کی توثیق کی ہے۔ بقول موریس بکائے ''ہمارے علم کے مطابق اسلام کے نقطۂ نظر سے مذہب اور سائنس کی حیثیت ہمیشہ دو جڑواں بہنوں کی سی رہی ہے''۔ [۲۶]

اب اس توضیح کے بعد درج اقتباس کا مطالعہ بھی مفید ثابت ہوگا:

''ان مختلف قسم کے طرز عمل کی طرف توجہ مبذول کرانے کا کام جو عیسائی مصنفین اس وقت کرتے رہے جب انہیں بائبل کے متون میں تمام سائنسی اغلاط سے سابقہ پڑا وہ اس بے چینی و بے اطمینانی کی ایک اچھی مثال ہے، جو ان میں پیدا ہوئی ہے، ان کو انسانی اختراع سمجھنے کے سوا کوئی منطقی استدلال قائم کرنا ناممکن ہے اور یہ بات بھی محال ہے کہ ان کو الہام کا کوئی جز مانا جائے''۔ [۲۷]

اس جائزہ سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب نے اپنی کتابوں میں صدہا تحریفیں کیں، مگر اس محرف حالت میں آج بھی اس میں قرآن مجید کے بیان کی تائید ملتی ہے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی تورات سے سلاطین کی دوسری کتاب کے سترہواں باب کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

''بلکہ انہوں نے ایسی شرارتیں کیں جس نے خداوند کو غصہ ور کیا، کیوں کہ انہوں نے بت پوجے، باوجود یہ کہ خداوند نے انہیں کہا تھا کہ تم یہ کام نہ کیجیو''۔ [۲۸]

اور اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ ''ازالۃ الشکوک'' بھی مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی ایک معرکۃ الآراء کتاب ہے۔ اس میں تحریف کا ایک خاص نقطۂ نظر سے جائزہ پیش کیا گیا ہے، یعنی تحریفات کی جتنی قسمیں ہوسکتی ہیں ان کو مع امثلہ پیش کیا گیا ہے۔ طوالت کے پیش نظر محض تحریف کی ایک اہم دلیل پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

''اس کتاب (بائبل) کے صدہا علماء نے اکثر مقامات میں دیدہ ودانستہ ان کتابوں کے مخالف کہا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر ان میں تحریف نہ ہوتی یا ان کی سب باتیں الہامی ہوتیں تو یہ لوگ پھر کیوں ایسا کرتے ہیں؟'' [۲۹]

اب اس شق پر بحث کی جائے گی کہ کیا تحریف کے ارتکاب کے باوجود بطور اہل کتاب وہ آج بھی خصوصی مقام کے حامل ہوسکتے ہیں، اگر ہیں تو ان کے کیا دلائل ہیں؟ اور نہیں ہیں تو اس کے دلائل کیا ہیں؟ اس سلسلے میں اہل علم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ پہلے مجوّزین کے دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔

جائز کہنے والوں کے دلائل

اس موقف کی تائید میں علامہ یوسف القرضاوی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اپنی مشہور کتاب ''اسلام میں حلال وحرام'' کے ایک باب ''غیر مسلمین سے تعلقات'' میں ایک ذیلی عنوان ''اہل کتاب کے ساتھ خصوصی رعایت'' قائم کیا ہے اور اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے انہوں نے قرآن مجید سے چند دلائل بھی پیش کیے ہیں اور ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ اہل کتاب چونکہ آسمانی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں اور مسلمانوں کے درمیان دین واحد کے اصولوں میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ علامہ

یوسف القرضاوی کے الفاظ درج ذیل ہیں:

> ''اسلام جہاں اپنے مخالفین کے ساتھ عدل اور حسن سلوک کرنے سے نہیں روکتا، خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، یہاں تک کہ وہ بت پرست مشرک ہی کیوں نہ ہوں وہاں وہ اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کے ساتھ خصوصی رعایت برتتا ہے، خواہ وہ دارالاسلام میں رہتے ہوں یا اس سے باہر۔ چنانچہ قرآن "**یا اهل الکتاب**" (اے اہل کتاب) اور "**یا ایها الـذیـن أوتـوا الکتاب**" (اے وہ لوگو! جنہیں کتاب دی گئی تھی) کہہ کر ان سے خطاب کرتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اصلاً آسمانی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا ان کے اور مسلمانوں کے درمیان رشتہ اور قرابت ہے یعنی اس دین واحد کے اصولوں میں اتفاق ہے، جو تمام انبیاء علیہم السلام کا دین رہا ہے''۔ [۳۰]

انہوں نے بطور دلیل سورہ شوریٰ آیت ۱۳ **شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحاً وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ** .کو پیش کیا ہے۔

> ترجمہ: اس نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جس کو تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو کی تھی کہ اس دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

اسی طرح علامہ قرضاویؒ نے سورہ عنکبوت آیت ۴۶، اور سورہ مائدہ آیت ۸۲ سے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جس طرح مسلمانوں سے اسلام مطالبہ کرتا ہے کہ اللہ کی تمام کتابوں اور تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے ایسے ہی انہیں یہ تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ جب کبھی اہل کتاب سے بحث کی نوبت آجائے تو احسن طریقہ اختیار کریں، تاکہ انہیں اسلام کی رواداری اور آفاقیت کا احساس ہو۔ اور اسلام نے اہل کتاب کے ساتھ ان کی عورتوں سے نکاح کو جائز قرار دیا ہے، ان کے

ذبیحہ کو کھانے کی اجازت دی ہے اور خصوصاً نصاریٰ کو تو اسلام سے مسلمانوں کے دلوں میں قریبی جگہ دی ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ آمَنُواْ الْيَهُودَ وَالَّذِيْنَ أَشْرَكُواْ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ آمَنُواْ الَّذِيْنَ قَالُوَاْ إِنَّا نَصَارَى. (سورۃ المائدۃ:۸۲)

ترجمہ: اور ایمان والوں کے ساتھ دوستی میں تم سب سے زیادہ ان لوگوں کو پاؤ گے، جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں۔

اسی طرح علامہ قرضاوی ایک دوسری جگہ رقم طراز ہیں:

''یہودی اور نصرانی کتابیہ سے نکاح ان کے اہل کتاب ہونے کی بنا پر قرآن نے جائز ٹھہرایا ہے اور ان کے ساتھ خصوصی معاملہ کرنے کی ہدایت کی ہے، اگرچہ انہوں نے اپنے دین میں تحریف کی ہے لیکن بہرحال وہ آسمانی مذہب کے حامل ہیں۔ اسلام نے جس طرح ان کا ذبیحہ جائز قرار دیا ہے ان کی عورتوں سے رشتہ مصاہرت قائم کرنا بھی جائز ٹھہرایا ہے''۔ [۳۱]

اسی بات کو قرآن مجید نے یوں پیش کیا ہے:

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ أُوتُواْ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ . (سورۃ المائدۃ:۵)

ترجمہ: اور حلال ہیں تمہارے لیے پاک دامن عورتیں، مسلمان عورتوں میں سے اور پاک دامن عورتیں ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی، جب تم انھیں ان کے مہر دے دو، اس طرح کہ تم نکاح میں لانے والے ہو

آپؐ نے بھی بعض دفعہ اہل کتاب کو ایک گونہ خصوصی مقام دیا ہے جیسا کہ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ آپؐ نے اہل کتاب کے بارے میں فرمایا:

''خدا نے تم لوگوں کے لیے یہ نہیں جائز کیا کہ اہل کتاب کے گھروں میں گھس جاؤ، مگر یہ کہ اجازت ہو، اور نہ یہ کہ ان کی عورتوں کو مارو، نہ یہ کہ ان

کے پھلوں کو نقصان پہنچاؤ''۔[۳۲]

محترم احمد دیدات صاحب جیسے مبلغ اسلام نے سورہ آلِ عمران آیت ۶۴ سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن نے یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب کا معزز خطاب دیا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دیگر اہل مذاہب کے مقابلے میں ایک امتیاز اور ایک خصوصی درجہ دیا ہے۔ دیدات صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''قرآن کریم میں یہودیوں اور عیسائیوں کو اہل کتاب کا معزز خطاب دیا گیا ہے۔ اور یہاں مسلمانوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ وہ انہیں دعوت دیں۔ ''اے اہل کتاب!، اے عالم انسانو! اے لوگو! تم جو اس بات کا دعویٰ کرتے ہو کہ تمہیں خدا کے الہام کیے ہوئے مقدس صحیفے حاصل ہیں، آؤ ہم ایک ساتھ ایک ہی بات کے قائل ہو جائیں کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں گے''۔[۳۳]

آگے مزید لکھتے ہیں:

''اس قرآنی آیت میں جو تین بیانات ہیں، ان کے ماحصل کو تو تمام یہودی وعیسائی قبول کرتے ہیں لیکن عمل میں وہ ناکام ہیں''۔[۳۴]

اس پس منظر میں اگر دیکھیں کہ اہل کتاب کو کیوں خصوصیت بخشی گئی ہے تو یہ حقیقت ہے کہ سارے انبیاء کا دین ایک تھا، لیکن شریعتیں الگ الگ ہیں۔ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

''وذلک ان دین الانبیاء علیهم السلام واحد، وان تنوعت شرائعهم، کما فی الصحیح عن ابی هریرة عن النبیؐ قال: انا معشر الانبیاء دیننا واحد''.[۳۵]

ترجمہ: اور ایسا اس لیے ہے کہ بلاشبہ سارے انبیاء علیہ السلام کا دین ایک ہی تھا، اگرچہ ان کی شریعتیں الگ الگ تھیں، جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم گروہ انبیاء کا دین ایک ہی ہے۔

اب اس کے بعد غیر مجوزین کے دلائل پیش کیے جا رہے ہیں تا کہ دونوں کے دلائل کا محاکمہ کر کے کوئی حتمی نتیجہ نکل سکے اور اس کی روشنی میں موجودہ اہل کتاب کے بارے میں لوگوں کی رہنمائی کی جا سکے۔

ناجائز کہنے والوں کے دلائل

یہود کی شرک و بت پرستی پر قرآن مجید نے بے شمار دلائل فراہم کیے ہیں۔ مثلاً الاعراف ۱۲۸، ۱۴۰، آلِ عمران: ۶۴، التوبۃ: ۲۹ وغیرہ۔ ان آیات کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود شرک و بت پرستی کی لعنت سے اپنے کو اس زمانہ میں بھی محفوظ نہیں رکھ سکے تھے، جب خدا کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے درمیان موجود تھے۔ اور خود ان یہودیوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور کارسازی کے نہایت عجیب و غریب واقعات کا بچشم خود مشاہدہ کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے انتقال کے بعد بھی وہ انہیں مشرکانہ عقائد میں ملوث رہے، چنانچہ قرآن مجید نے ان کے کئی مشرکانہ عقائد و اعمال کا ذکر کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ وہ ایمان کی راہ ہدایت اور توحید کی صراط مستقیم سے منحرف ہو کر کفر و شرک کی گمراہیوں میں پھنس گئے تھے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ 'یہود اور قرآن مجید' میں لکھتے ہیں:

> ''یہود زبان سے ضرور اللہ پر ایمان اور توحید کے اقرار کے مدعی تھے، لیکن ان کے عقیدہ و عمل سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی تھی، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ سب سے پہلے تم ان کو اس مرکزی نقطہ کی دعوت دو جو تمہارے اور اہل کتاب کے درمیان مشترک ہے''۔[۳۶]

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّه. (سورہ آلِ عمران: ۶۴) ترجمہ: کہو! آؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مسلّم ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ سے استدلال کرتے ہوئے مولانا اصلاحی مزید لکھتے ہیں:

> ''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے نزدیک یہ امر مسلم تھا کہ اللہ کے سوا نہ کسی کی بندگی کی جائے اور نہ کسی کو اس کا ساجھی اور شریک بنایا

جائے، مگر اس کے باوجود ان کا عمل اس کے خلاف تھا۔ اس لیے قرآن نے ان کا یہ تناقض دور کرنے، توحید خالص کا علم بردار بن جانے اور شرک وکفر سے بیزاری اختیار کرنے کی تلقین کی تھی۔ مگر انہوں نے اس کی مخلصانہ دعوت کی قدر نہیں کی اور شرک وبت پرستی کی تاریکیوں سے نکل کر ایمان ویقین کی بصیرت میں آنا پسند نہیں کیا۔ اس لیے قرآن سرے سے یہود کے ایمان کی نفی کرتا اور ان کو کفار ومشرکین کی صف میں شامل کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ توبہ آیت ۲۹ میں عرب کے کفار ومشرکین کی طرح ان سے بھی ترک موالات اور جہاد کا حکم ان لفظوں میں دیا گیا ہے''۔ [۳۷]

قَاتِلُواْ الَّذِيْنَ لاَ يُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّهُ وَرَسُولُهُ وَلاَ يَدِيْنُونَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوتُواْ الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُواْ الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُون. (سورۃ التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: ان اہلِ کتاب سے لڑو جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام ٹھہرائے کو حرام ٹھہراتے، اور نہ دین حق کو اپنا دین بناتے، یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اس آیت سے یہ واضح ہوگیا کہ اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کا اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رہا تھا، کیوں کہ وہ دین حق سے منحرف ہوگئے تھے اور احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ سورہ مائدہ آیت ۸ میں ان لوگوں پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی زبان سے لعنت کی گئی ہے۔

اسی طرح سورہ توبہ آیت ۳۰ ان اہل کتاب کے عقیدۂ توحید میں آمیزش کی گواہی دے رہی ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّهِ وَقَالَتْ النَّصَارَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّهِ ذَلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِؤُونَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُواْ مِن

قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنّٰى يُؤْفَكُون.

ترجمہ: اور یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔ وہ ان لوگوں کی باتیں نقل کر رہے، جنھوں نے ان سے پہلے کفر کیا۔ اللہ ان کو ہلاک کرے، وہ کدھر بہکے جا رہے ہیں۔

علامہ ابن حزم نے یہودی مذہب پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

''اس قوم کے کفر اور ان سے پہلے ان کفار پر جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول پر افترا پردازی کی، پھر اس کتاب پر جس میں اس طرح کی چیزیں لکھی گئیں ہیں اور اس کے کاتب پر اتنی ہی بار لعنت وغضب ہو جتنی ان اہل کتاب پر''۔[۳۸]

اسی طرح علامہ ابن حزم عیسائیوں کے عقائد سے متعلق لکھتے ہیں:

''عیسائی اہل کتاب ضرور ہیں، مگر جمہور عیسائی اور ان کے تمام فرقے توحید خالص کا اقرار نہیں کرتے، بلکہ تثلیث کے قائل ہیں''۔[۳۹]

آگے ان پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''اگر اللہ قرآن مجید میں ان کے یہ اقوال نہ بیان کرتا **لقد كفر الذين قالوا ان اللّٰه هو المسيح بن مريم، ان اللّٰه ثالث ثلاثة، أأنت قلت للناس اتّخذونى وأمى الٰهين من دون اللّٰه** تو ہرگز کسی مومن کی زبان اس قول شنیع کو نقل نہ کر سکتی، بخدا اگر ہم نے خود اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ نہ کیا ہوتا تو ہرگز نہ مانتے کہ دنیا میں کوئی بے عقل قوم عیسائی بھی ہے''۔[۴۰]

جائز و ناجائز کے قائلین کی آراء کا محاکمہ

جمہور مفسرین وعلماء کے نزدیک اہل کتاب مومن نہیں ہیں بلکہ مشرک ہیں۔ اگر انہیں خصوصی

مقام دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن مجید میں انہیں بعض مقامات پر یا اہل الکتاب (اے اہل کتاب!) یا ایہا الذین اُوتوا الکتاب (اے وہ لوگو! جنہیں کتاب دی گئی تھی) کہہ کر ان سے خطاب کرتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا تعلق آسمانی کتابوں سے ہے اس لیے ان کے اور مسلمانوں کے درمیان رشتہ اور قرابت یعنی اس دین واحد کے اصولوں میں اتحاد و اتفاق پایا جاتا ہے جو تمام انبیاء علیہ السلام کا دین رہا ہے جیسا کہ سورہ شوریٰ آیت ۱۳ میں ہے۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحاً وَالَّذِيْ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيْمَ وَمُوسَى وَعِيْسَى أَنْ أَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِيْ إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِيْ إِلَيْهِ مَن يُنِيْب. (سورہ شوریٰ:۱۳)

ترجمہ: اس نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو۔ مشرکین پر وہ بات بہت گراں ہے جس کی طرف تم ان کو بلا رہے ہو۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف چن لیتا ہے۔ اور وہ اپنی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اس طرح سر سید احمد خاں مرحوم اہل کتاب کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے، ان کے پیش نظر بعض وقتی مصلحتیں تھیں۔ جس طرح انہوں نے اسباب بغاوتِ ھند اور اسباب سرکشی بجنور لکھ کر انگریزوں کو اصل حقیقت سے آگاہ کرنا چاہا۔ اسی طرح تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل لکھی تا کہ سامی مذاہب یعنی اہل کتاب اور اہل اسلام میں افہام و تفہیم کی راہ نکلے۔ اور یہ کتاب وہ ۱۸۵۷ء میں غدر کے ہولناک مناظر دیکھنے کے بعد لکھنے میں جٹ گئے، اس کے لیے انہوں نے بڑا اہتمام کیا جیسا کہ مولانا حالی نے لکھا ہے:

''اول انہوں نے عیسائی مذہب کی تمام ضروری کتابیں، بائبل کی تفسیریں اور یوٹیرین مذہب کی کتابیں خریدیں۔ ایک انگریز خواں کو جو ان کتابوں

کے ضروری مقالات کا ترجمہ کر کے سناتا تھا اور کتب تفاسیر واحادیث سے سندیں بہم پہنچانے کے لیے ایک عربی داں کو نوکر رکھا۔''[۴۱]

مولانا حالیؒ آگے مزید لکھتے ہیں:

''اس کے بعد بائبل کی تفسیر لکھنے اور قرآن وحدیث سے اس کی تطبیق کرنے کا ارادہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ اصول اسلام اور احوال اہل کتاب میں جہاں تک ممکن ہو مطابقت ثابت کی جائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کی وجہ بیان کی جائے''۔[۴۲]

ان مذکورہ دونوں پیراگراف سے تبیین الکلام کی غرض وغایت معلوم ہوگئی کہ اصل منشا اس کا جہاں تک ممکن ہو اہل کتاب سے ہم آہنگی اور مطابقت پیدا ہو جائے۔

علامہ یوسف القرضاویؒ جیسے نامور فقیہ ایک طرف قرآن وسنت کی روشنی میں اہل کتاب کے ساتھ خصوصی مراعات ومقام دینے کے قائل ہیں لیکن وہ بھی جمہور مفسرین کی طرح اہل کتاب کو مشرک مانتے ہیں۔ جیسا کہ دوحہ کے ایک اخبار نے ایک مرتبہ یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ عیسائی مومن ہیں کافر نہیں اور اپنے موقف کی تائید میں قرآن مجید کی بعض آیات اور احادیث کو پیش کیا تھا۔ اس کا دندان شکن جواب دیتے ہوئے علامہ قرضاوی نے لکھا کہ عیسائی ہرگز مومن نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ ''موقف الاسلام العقدی'' کے تعارف نامہ سے واضح ہے۔

''هذا الكتاب جاء ردا على مقالة كتبها صحيفة فى جريدة الدوحة، تقول استنادا الى بعض الآيات والاحاديث بان النصارى مؤمنون وليسوا كفاراً، فردّ عليها الدكتور يوسف القرضاوى رئيس الاتحاد العالمى لعلماء المسلمين ووضح لها المغالطات والاخطاء الشرعية التى كتبها فى مقالها، فيحدثنا فى هذا الكتاب عن الناحية العقدية وموقف الاسلام من النصارى واليهود وهل هم كفار ام لا، ويعطى الادلة الشرعية التى تثبت ذلك''.[۴۳]

ترجمہ: یہ کتاب اس مقالے کی رد میں منظرِ عام پر آئی جسے دوحہ کے ایک اخبار 'جریدہ الدوحۃ' نے لکھا تھا، اور اس میں بعض قرآن کی آیات اور احادیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا تھا کہ عیسائی مومن ہیں، وہ کافر نہیں۔ ڈاکٹر علامہ یوسف القرضاویؒ (سربراہ الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین) نے اس اخبار کا رد لکھا اور اس مقالے میں جو غلط بیانیاں اور شرعی غلطیاں تھیں انہوں نے ان کو واضح کیا۔ اس طرح ہمارے سامنے نصاری اور یہودیوں کے بارے میں اس کتاب میں اسلام کے موقف کو بیان کیا۔ یہ لوگ کافر ہیں یا نہیں اس پر انھوں نے ایسے شرعی دلائل پیش کیے ہیں جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں۔

آگے علامہ یوسف القرضاوی نے ان سے متعلق جو موقف اختیار کیا ہے، کتاب کی فہرست کے اہم مشمولات کو پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے اہل کتاب کا کفر ظاہر و باہر ہو جاتا ہے۔ اور اس میں کسی تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

"موقف الاسلام العقدی من کفر الیهود والنصاریٰ، هل تکفی (لا اله الا الله) وحدها، الایمان بالرسل رکن اساسی فی العقیدة، رسالة محمد للعالمین ومنهم الیهود والنصاریٰ، دلائل اخریٰ علی کفر اهل الکتاب، النصاری ابعد عن ملة ابراهیم من الیهود، خلیط من الأعلام والأوهام، اساس التسامح الاسلامی وکیف یتسامح المسلم مع من یعتقد کفره وغیره".

ترجمہ: یہود و نصاری کے کفر کے بارے میں اسلامی عقیدہ، کیا صرف لا الہ اللہ کہنا زبان سے کافی ہے۔ ایمان بالرسل اسلامی عقیدہ کا ایک بنیادی رکن ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پوری دنیا کے لیے ہے، اس میں یہود و نصاریٰ سب لوگ شامل ہیں۔ اہلِ کتاب کے کفر کے دیگر

دلائل، نصاریٰ ملت ابراہیمی سے بہت دور ہیں، یہودیوں کا اعلام (واضح) اور اوہام (غیر واضح) کو خلط مبحث کرنا۔ اسلامی رواداری کی بنیاد، اور مسلمان کیسے رواداری برتیں اس شخص کے ساتھ جو اس کے کفر کا اعتقاد رکھتا ہے۔

سینٹ پال سے قبل اصل عیسائیت کے عقائد

قرآن مجید اور دیگر اسلامی مأخذ کے مطالعہ سے یہ بات بالکل صاف ہے کہ سینٹ پال سے قبل اصل عیسائیت کے عقائد وہی تھے جس کی وضاحت سورہ مائدہ آیت:۴۶ میں کی گئی ہے۔

وَقَفَّيْنَا عَلَى آثَارِهِم بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الإِنجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ. (المائدہ:۴۶)

ترجمہ: اور ہم نے ان کے پیچھے عیسیٰ کو بھیجا جو اپنے سے پہلے کی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرنے والے تھے اور ہم نے انہیں انجیل عطا فرمائی، جس میں نور اور ہدایت ہے اور اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرتی تھی، دوسرے اس میں ہدایت ونصیحت تھی پارسا لوگوں کے لیے۔

اسی طرح قرآنی انسائیکلوپیڈیا کے مصنف ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن العمریؒ (المائدہ:۴۷) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس کے مطلوبین آج کل کے نصاریٰ نہیں ہیں بلکہ وہ ہیں جن پر انجیل نازل کی گئی تھی، لیکن انہوں نے اس کے مطابق فیصلہ نہیں کیا، بلکہ توحید کی جگہ شرک کو اپنالیا، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا بیٹا بنالیا۔ اگر اس سے آج کل کے عیسائی مراد ہیں تو سب سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کی پیش گوئی کو مانیں، جس میں انھوں نے ایک رسول کے آنے کی اطلاع دی

ہے جس کا نام محمدؐ ہے''۔[۴۴]

قرآن مجید کی یہ روشن تعلیمات ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہیں کہ اللہ کے پیارے سچے، انبیاء ورسل کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی توحید کی لوگوں کو دعوت دی تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیائے بنی اسرائیل کی تعلیمات کی تصدیق کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ اللہ کے سارے احکامات میں اولین حکم یہ ہے :

''اے اسرائیل سن! خداوند ہمارا خدا ایک خداوند ہے''۔

(مرقس ۱۲:۲۸-۲۹)

اور اس طرح سے اپنے پیروکاروں کو یہ حکم دیا:

''تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اس کی عبادت کر''۔(متی ۴:۱۰)[۴۵]

پروفیسر ساجد میر نے اس موضوع پر گہرا تجزیہ کیا ہے اور نیو کیتھولک انسائیکلو پیڈیا کے حوالہ سے اپنا تجزیہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''تثلیث کا یہ عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قریبی ساتھیوں کی طرف سے نہیں آیا بلکہ بعد کے زمانہ کی پیداوار ہے۔ چنانچہ عیسائیوں کی مستند کتاب نیو کیتھولک انسائیکلو پیڈیا میں ہے:

The formation "One God in three forms" was not solidly established, certainly not fully assimilated into certain life and its profession of faith, prior to the end of the 4th century".[۴۶]

یعنی ''ایک خدا اور تین اقنوم کا قاعدہ چوتھی صدی کے اختتام سے قبل تک عیسائی زندگی اور اس کے اقرار ایمان میں مضبوطی سے قائم شدہ اور پورے طور شامل نہیں تھا''۔

اس کے بعد اس جہت پر بحث مرکوز کی جارہی ہے کہ بعد میں ان میں کب اور کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں؟

جدید عیسائیت میں کب اور کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں؟

تاریخ شاہد ہے کہ جس طرح سامری نے بچھڑا بنا کر اس کو الٰہ ثابت کرنے کی کوشش کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیبوبت کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور یہاں تک کہنے کی جسارت کی کہ یہی بچھڑا تمہارا اور موسیٰ کا بھی رب ہے جیسا کہ سورہ طہٰ آیت ۸۸ میں ہے:

فَأَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلاً جَسَداً لَهُ خُوَارٌ فَقَالُوا هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَى فَنَسِيَ. ترجمہ: پس اس نے ان کے لیے ایک بچھڑا برآمد کر دیا۔ ایک مورت جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ پھر انھوں نے کہا کہ یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا معبود بھی، موسیٰ اسے بھول گئے۔

ٹھیک ایسی ہی فطرت کا مالک سینٹ پال تھا۔ اس کے کئی نام ملتے ہیں، پولس اس کا رومی نام تھا اور عبرانی ساؤل یا شاؤل تھا۔ اس کے لفظی معنیٰ ''خدا سے مانگا ہوا'' ہے۔ سوال یہ ہے کہ سینٹ پال (پولس) کون تھا، جس نے عیسائیت کے نام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصل دین میں انحراف پیدا کیا اور ان سے مختلف ایک دین کی بنا رکھی۔ یہ اصلاً یہودی النسل تھا جیسا کہ پروفیسر ساجد میر نے لکھا ہے:

''وہ یہودی النسل ہونے کے لحاظ سے رومیوں کی غلام قوم سے تعلق رکھتا تھا، مگر اسے سلطنت رومیہ کے مکمل شہری حقوق حاصل تھے، جس سے اس نے اپنی تبلیغ کے دوران خوب فائدہ اٹھایا اور اس کے دوران اس نے اپنے رومی نام ہی کو استعمال کیا۔ چنانچہ انجیل کی کتاب ''رسولوں کے اعمال'' میں باب ۱۳ آیت ۹ میں اس کا یہی نام مذکور ہے''۔[۴۷]

جس طرح سامری نے قوم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ غداری کی اور ان کے سامنے شریعت موسوی میں تحریف کا ارتکاب کیا۔ اس کے لیے ایک انوکھا حیلہ تراشا جس کو قرآن مجید نے اس کی زبان میں یوں نقل کیا ہے:

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي. (طہٰ:۹۶)

ترجمہ: اس نے کہا کہ مجھ کو وہ چیز نظر آئی جو دوسروں کو نظر نہیں آئی تو میں نے رسول کے نقش قدم سے ایک مٹھی اٹھائی اور وہ اس میں ڈال دی۔ میرے نفس نے مجھ کو ایسا ہی سمجھایا۔

سنٹ پال (پولس) نے بھی اسی روش پر چل کر عیسائیت میں سیندھ لگائی اور اس میں وہ اپنی چالاکی اور عیاری سے کامیاب ہوا، وہ عیسائیوں کی نفسیات سے خوب واقف تھا، اس نے سامری چال چلی اور ایک جھوٹے مکاشفے کا انکشاف کیا جیسا کہ اعمال ۹، ۲۰-۹، ۲۴ وغیرہ کے حوالے سے پروفیسر ساجد میر صاحب نے اس کے متعلق تحریر فرمایا ہے:

''دمشق کے راستے میں اس (سینٹ پال) کے بقول اس نے ایک نور دیکھا، جس سے آواز آئی: اے ساؤل! اے ساؤل! تو مجھے کیوں ستاتا ہے؟ پھر کہا گیا: میں یسوع ہوں جسے تو ستاتا ہے'' اور اسے گواہ مقرر کیا گیا۔ خیال رہے کہ یہ آواز پولس کے ہم راہ ساتھیوں نے نہیں سنی، گو وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ انہوں نے نور کو دیکھا''۔ [۴۸]

عیسائی مذہب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے ساتھ پولس کو بھی رسول کا لقب دیا گیا ہے، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ 'پولس' ان رسولوں یا حواریوں میں شامل نہیں تھا جن کا انتخاب خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا، بلکہ وہ تو 'رسول' ہونے کے اس معیار پر بھی کامل نہیں اترتا تھا جو حواریوں نے یہودا اسکریوتی کی غداری کے بعد اپنی (۱۲) کی تعداد کو پوری کرنے کے لیے وضع کی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ 'پولس' کے اپنے مذکورہ بالا (مکاشفہ) کے بعد وہ خود ہی رسول بن بیٹھا۔ یعنی اپنی شاطرانہ روش کی بنیاد پر وہ خود ساختہ رسول ہو گیا۔ موریس بکائے نے اسے غدار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''پولس کی حیثیت ایک غدار کی سی تھی۔ یہودی، عیسائیت کے لیے جو ''وفادار'' رہے پولس کی حیثیت ایک غدار کی سی تھی۔ یہودی عیسائیت کی تحریروں میں اسے دشمن کہا جاتا ہے اور ان کو ''عیارانہ دوعملی'' کا الزام دیا جاتا ہے.... کلیسا میں یہود و عیسائیت کی ہی اکثریت رہی اور پولس کی

حیثیت اکل کھرے کی سی ہے''۔ [۴۹]

پال کا پول کئی مأخذ کی روشنی میں کھولا جاسکتا ہے، جیسا کہ قاموس مذہب واخلاقیات میں ہے۔

"They denied his aportleship, which is true, rested on one formal nomination by other apostles" [۵۰]

یعنی لوگوں نے اس کی رسالت کا انکار کیا اور یہ حقیقت ہے کہ اس کی رسالت (دستور کے مطابق) باقی رسولوں کی طرف سے نامزدگی پر مبنی نہیں تھی۔

آگے پروفیسر ساجد میر نے ''اعمال'' اور دیگر مراجع کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ اس نے اپنے مکاشفہ پر ہی مذہب کی بنیاد رکھی۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''باقی ''رسول''، بھی اسے قبول کرنے سے بہت ہچکچاتے تھے مگر برناباس کی سفارش پر، جسے وہ اپنا مخلص ساتھی گردانتے تھے، انہوں نے اسے اپنے ساتھ آنے جانے کی اجازت دی تھی تاہم اس نے اپنی انجیل یا خوش خبری کی بنیاد ان کی تعلیم پر نہیں بلکہ اپنے مکاشفات پر رکھی۔ یاد رہے اس نے اپنے پہلے مکاشفہ کے بعد اپنے ہر قول کو دین کی بنیاد کا دروازہ یہ کہہ کر کھول لیا تھا کہ مسیح آئندہ بھی اس پر ظاہر ہوا کریں گے''۔

یہ سارے دینی، تاریخی اور سائنسی شواہد اور دلائل اس بات پر شہادت کے لیے کافی ہیں کہ آج کی عیسائیت اصل عیسائیت نہیں رہ گئی بلکہ پالوی تعلیمات کا ملغوبہ ہے۔

انجیلوں کے مآخذ پر ایک نظر

اس وسیع جائزے اور تجزیے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ موجودہ اناجیل اپنی اصلی صورت کھوچکی ہیں اور ان میں ہر طرح کی تحریفات پائی جاتی ہیں۔ ان کے متون کے تنقیدی مطالعے خود تناقضات کو جنم دیتے ہیں۔ بقول موریس بوکائے:

''یہی وہ چیز ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہوا کہ جو انجیل اس وقت

موجود ہیں وہ پرتو ہیں اس حقیقت کا جو ابتدائی عیسائی فرقے یسوع مسیح کی کی حیات اور پادریوں کی جماعت کے بارے میں رکھتے تھے۔ وہ ان عقائد اور دینی تصور کی آئینہ دار بھی ہیں جن کے انجیلوں کے مرتبین ترجمان تھے۔''

اس طرح جدید ترین مطالعہ نے یہ بات صاف طور پر واضح کردی ہے کہ انجیلوں کے متون کی تشکیل میں اور بھی زیادہ پیچیدگی اختیار کی گئی ہے۔ پروفیسر بوکائے نے انجیلوں کے مآخذ پر تحقیقی بحث کی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ''جب ہم انجیل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ذرا بھی اس بات کا یقین نہیں ہوتا کہ ہم مسیح کے الفاظ پڑھ رہے ہیں''۔

اسی طرح ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "The Text of the Quran from Revelation to Compilation with a critical study of old and New Testaments" میں عہد نامہ قدیم وجدید میں ہونے والی تحریفات کا پردہ چاک کیا ہے اور مستند دلائل سے ان میں ہونے والی تبدیلی وتحریفات کو پیش کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب اس موضوع پر سیر حاصل بحث کرتی ہے اور اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالتی ہے کہ چونکہ تورات وانجیل میں تحریف ایک روشن حقیقت ہے اس لیے وہ قرآن کریم کو بھی غیر محفوظ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں اور ضعیف احادیث کا سہارا لے کر اس کے سلسلے میں طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔

اس مختصر جائزے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ اناجیل کی طرح انجیلوں کے مآخذ بھی مشکوک ہیں اور ان کے متون غیر مستند عبارتوں کا مجموعہ ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا موقف ایک استفتاء کے جواب میں اس بارے میں ملاحظہ کریں:

''رہا عیسائی مذہب تو اس کی اصل تعلیمات جنھیں لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں بھی بنیادی چیز توحید اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور بعث بعد الموت تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی بتلایا تھا کہ میرے بعد ایک نبی (محمدؐ) آنے والا ہوگا اور اس کی نبوت علم گیر ہوگی، اس نبی کے آنے کے بعد انھیں کی اتباع ضروری ہوگی،

لیکن آج کل جو عیسائیت موجود ہے، یہ تحریف شدہ عیسائیت ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد بہت سے خود ساختہ عقائد اس میں شامل کر لیے گئے ہیں مثلاً توحید کی جگہ تثلیث وغیرہ۔(بذریعہ نیٹ، دارالافتاء دارالعلوم دیو بند، انڈیا)۔

ایسے ہی ایک فتویٰ کی رو سے اہل کتاب کی پوزیشن مندرجہ ذیل سمجھی جائے گی۔
سعودی عرب کے مشہور جید عالم اور شاہ سعود یونیورسٹی میں استاذ شیخ عبد الرحمٰن بن ناصر البراک اپنے ایک فتویٰ میں لکھتے ہیں:

"لكن دلت النصوص من الكتاب والسنة على الفرق بين اهل الكتاب وغيره من الكفار فى بعض الاحكام، فمن ذلك، حل ذبائح اهل الكتاب، وحل نسائهم الحرائر العفيفات: كما قال تعالىٰ الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ أُوتُواْ الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ أُوتُواْ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ."(المائدۃ:۵)
(بذریعہ نیٹ فورم ڈاٹ کام)

ترجمہ: لیکن کتاب وسنت کے نصوص بعض احکام میں اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب (کفار) کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہیں۔اسی میں یہ بات بھی ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے، ان کی بیویاں سے نکاح جائز ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول:

الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ أُوتُواْ الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ أُوتُواْ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ إِذَا

آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُن.(المائدۃ:۵)

ترجمہ: آج تمہارے لیے سب ستھری چیزیں حلال کردی گئیں۔ اور اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور حلال ہیں تمہارے لیے پاک دامن عورتیں، مسلمان عورتوں میں سے اور پاک دامن عورتیں ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی، جب تم انھیں ان کے مہر دے دو۔

حرفِ آخر

قرآن مجید پچھلی تمام کتب آسمانی کے لیے مھیمن ہے یعنی اس میں تمام برحق تعلیمات جو پچھلی کتب آسمانی میں دی گئی ہیں اسے اپنے اندر محفوظ کیے ہوئے ہے۔ اور بقول مولانا مودودیؒ ''اور جو قرآن کے خلاف ہے وہ لوگوں کا کلام ہے''۔ یعنی وہ تحریفات وتلبیسات کا مجموعہ ہیں۔

تورات وانجیل میں تحریف کب واقع ہوئی، اس سوال کا حتمی جواب دینا مشکل ہے۔ جیسا کہ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے لکھا ہے۔ البتہ گمان غالب یہ ہے کہ جب تورات کا نسخہ متعدد بار گم ہوا، اور خصوصاً اس وقت جب کہ بخت نصر نے ہیکل کو نذر آتش کردیا، اور یہودیوں کو بابل میں قید کردیا تھا۔

موجودہ بائبل کے عہد قدیم وجدید دونوں میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں اور ان میں اس قدر غلطیاں، تضادات اور تناقضات موجود ہیں، جو تحریف کی کھلی شہادت دیتے ہیں۔

اہل کتاب کو قرآن مجید میں یا اہل الکتاب کے معزز لقب سے مخاطب کیا گیا ہے اور مسلمانوں کی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے بھی جدامجد ہیں۔ اس پس منظر میں اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل کتاب کو کیوں خصوصیت بخشی گئی ہے؟ کیوں انہیں اس طرح قرآن مجید میں جگہ جگہ مخاطب کیا گیا ہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سارے انبیاء کا دین ایک ہی تھا اور گرچہ ان کی شریعتیں الگ الگ تھیں جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ ''**وذلک ان دیـــــن الانبیاء علیھم السلام واحد وان تنوعت شرائعھم**''.

سینٹ پال سے پہلے اصل عیسائیت کے وہی عقائد تھے، جو سارے نبیوں کے عقائد

تھے۔سینٹ پال نے سامری کی روش اختیار کرتے ہوئے عیسائیت کو اپنے خاص رنگ میں رنگ دیا۔اوراس سلسلے میں اپنے جھوٹے مکاشفات کا سہارا لیا،اورآج جو مذہب عیسائیت رائج ہے وہ اسی کا شاخسانہ اوراس کی ذہنی اپج معلوم ہوتی ہے۔

مراجع ومصادر

۱۔ وکی پیڈیا ایمان مفصل،وتعلیم الاسلام،مفتی کفایت اللہ دہلوی،ج:۱،کتب خانہ عزیزیہ،جامع مسجد دہلی،ص:۳

۲۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ،تفہیم القرآن،ج:۱،مرکزی مکتبہ اسلامی دہلوی،۲۰۱۸ء،ص ۴۷۷

۳۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن الاعظمی،قرآن انسائیکلوپیڈیا،فرایوائی اکادمی،نئی دہلی،۲۰۱۸ء،ص:۲۳۳

۴۔ قرآنی مقالات،ادارہ تعلوم القرآن،سرسید نگر علی گڑھ،۱۹۹۱ء،ص:۴۵

۵۔ اظہار الحق،مولانا رحمت اللہ الکیرانوی،بذریعہ انٹرنیٹ،ص:۴۳،بحوالہ بدء تحریف التوراۃ والانجیل (رقم الفتویٰ ۴۳۱۴۸)

۶۔ الدکتور ضیاء الرحمٰن الاعظمی، **دراسات فی الیھودیة والمسیحیة و أدیان الھند**،ص:۲۲۲،(بذریعہ انٹرنیٹ)

۷۔ لشہرستانی،**الملل والنحل**،ج:۲،**فی سوق الحضار القدیم بمصر سنة**۱۳۱۷ھ،ص:۵۱

۸۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی،یہود اور قرآن مجید،دار المصنّفین شبلی اکیڈمی،۲۰۱۵ء،ص:۴۸

۹۔ مختصر کتاب اظہار الحق،(مولانا رحمت اللہ الکیرانوی)،اختصار وتدویق محقق الکتاب د۔محمد احمد ملکاوی،**المملکة العربیة السعودیة**،۱۴۱۶ھ،ص:۲۶

۱۰۔ قرآن انسائیکلوپیڈیا،ص:۱۴۳

۱۱۔ موریس بوکائلے(مترجم ثناء الحق صدیقی)،بائبل،قرآن اور سائنس،تاج کمپنی دہلی،۱۹۹۸ء،ص:۹۸

۱۲۔ حوالہ سابق،ص:۹۹

۱۳۔ قرآنی مقالات،ص:۴۶

۱۴۔ مولانا رحمت اللہ اعظمی،عیسائیت انجیل کی روشنی میں(اول)،محاضرہ علمیہ بسلسلۂ اہل کتاب(دار العلوم دیوبند)، ص:۲۶-۲۷

۱۵۔ حوالہ سابق،ص:۳۴

۱۶۔ مختصر کتاب اظہار الحق،ص:۶۲

۱۷۔ حوالہ سابق،ص:۶۴

۱۸۔ حوالہ سابق، ص:۶۵

۱۹۔ حوالہ سابق، ص:۶۸

۲۰۔ مولانا نعمت اللہ اعظمی، عیسائیت کلیسا کی روشنی میں، محاضرہ علمی (۲)، دارالعلوم دیوبند، ص۴۶-۴۷

۲۱۔ George Barclay: The Making and Meaning of the Bible, p-48
(بحوالہ پروفیسر ساجد میر، عیسائیت تجزیہ، مطالعہ، مکتبۃ الفہیم مئوناتھ بھنجن، ۲۰۰۶ء، ص:۲۸۰)

۲۲ Encyclo, Brit; (1973) Vol. 3, P:574

۲۳۔ Irene Allen: The Early Church and the New testament, P"192, New Catholic Encyclopedia, Vol. 7; P 1083-84

۲۴۔ بائبل، قرآن اور سائنس، ص:۴۸

۲۵۔ حوالہ سابق، ص:۲۵

۲۶۔ حوالہ سابق، ص:۸۴

۲۷۔ یہود اور قرآن مجید، ص:۳۶

۲۸۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی، **ازالۃ الشکوک**، ج:۴، **مکتبہ معہد الشریعۃ** لکھنؤ، ۲۰۱۵ء، ص:۱۱۵-۱۱۶

۲۹۔ علامہ یوسف القرضاوی، حلال وحرام، الدارالسلفیہ، ممبئی، ۲۰۰۰ء، ص:۲۴۴

۳۰۔ حوالہ سابق، ص:۲۲۲

۳۱۔ ابن ہشام، **سیرۃ النبی علیہ الصلوۃ و السلام، الجزء الاول**، طبع مطبعۃ علی صبیح بمیزان الازہر، ص:۲۲۲

۳۲۔ احمد دیدات، بائبل حضرت محمدؐ کے متعلق کیا کہتی ہے؟ اقراء ٹرسٹ جوگیشوری، ممبئی نمبر۱۰۲، ص:۳۰

۳۳۔ حوالہ سابق، ص:۳۰

۳۴۔ علامہ ابن تیمیہ، مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ج:۱، معہد امام الدعوۃ بالریاض، ۱۳۹۸ھ، ص:۳۵۷

۲۵۔ یہود اور قرآن مجید، ص:۳۰

۳۶۔ حوالہ سابق:۳۰

۳۷۔ للشہرستانی، **الملل و النحل، فی سوق الحضار القدیم بمصر** سنۃ۱۳۱۷ھ، ص:۱۸۶

۳۸۔ حوالہ سابق، ص:۱۸۶

۳۹۔ حوالہ سابق، ص:۱۸۷

۴۰۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید، قومی کونسل برائے فروغ اردو دہلی، ۲۰۱۳، ص:۱۱۵

۴۱۔ حوالہ سابق، ص:۱۱۴

۴۲۔ العلامۃ یوسف القرضاوی، **موقف الاسلامی العقدی من کفر الیھود و النصاریٰ**، بذریعہ نیٹ، ص:۱

۴۳۔ قرآن انسائیکلوپیڈیا، ص:۱۴۳

۴۴۔ عیسائیت تجزیہ و مطالعہ، ص:۳۶

۴۵۔ حوالہ سابق، ص:۴۶

۴۶۔ حوالہ سابق، ص:۴۹

۴۷۔ حوالہ سابق، ص:۴۸

۴۸۔ بائبل، قرآن اور سائنس، ص:۹۷

۴۹۔ عیسائیت تجزیہ و مطالعہ، ص:۴۹

۵۰۔ حوالہ سابق، ص:۵۰

ظفر دارک قاسمی *

ہندوستانی مذاہب پر مسلم علماء کا تحریری سرمایہ

(۳)

گیتا کا تعارف

یہ سچ ہے کہ گیتا ہندوازم کا ایک اہم مصدر اور ماخذ ہے۔ اس کی اہمیت وافادیت کو بہت سارے مفکرین نے واضح کیا ہے چنانچہ ذیل میں گیتا کا تعارف پیش ہے:

> ''بھگوت گیتا مہابھارت کے چھٹے باب بھیشم پروکا ایک حصہ سنسکرت ادب میں مشہور ترین منظوم ادب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بارے میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ یہ انتہائی حسین منظوم کلام ہے اور غالباً کسی معروف زبان میں موجود واحد صداقت پر مبنی فلسفیانہ نظم ہے۔ گیتا کے ابواب میں ایسا تارک دنیا اور عارف کا کردار نظر آتا ہے جو اپنے احساس وشعور اور علم و ادراک کے جوش وجذبے میں بولتا ہے نہ کہ ایک فلسفی اور دانشور کا کردار جو کسی اسکول یا کالج کا پروردہ ہو اور جو اپنے ہاتھ سے مطالعہ یا مواد کو کئی

* پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلو، شعبۂ سنی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ zafardarik85@gmail.com

حصوں میں تقسیم کر کے اور منتشر افکار و خیالات کو ترتیب دے کر کسی نتیجے تک پہنچتا ہو۔ بھگوت گیتا کی تاریخ تصنیف کے بارے میں بعض اہل علم نے شبہ ظاہر کیا ہے اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مہا بھارت میں یہ حصہ بعد کا اضافہ ہے۔ لیکن مہا بھارت موجود بھگوت گیتا کے بارے میں ایسے داخلی شواہد ہیں جن کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ بھگوت گیتا بعد کا اضافہ نہیں بلکہ مہا بھارت کے زمانہ تصنیف سے ہی اس رزمیہ نظم کا اہم حصہ رہی ہے۔ گیتا اور مہا بھارت میں اسلوب بیان کی یکسانیت اس بات پر دال ہے کہ گیتا بنیادی طور پر مہا بھارت کا ہی جزو ہے۔ فلسفہ اور مذہب سے متعلق افکار و خیالات میں بھی توافق و ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔''[1]

یعنی پتہ یہ چلا کہ گیتا مہا بھارت کا اہم حصہ ہے اور اس میں جو کلام پایا جاتا ہے ہے وہ انسان کو پرہیز گار اور عارف و متقی بنا دیتا ہے۔ گیتا کو درج ابواب میں منقسم کیا گیا ہے یعنی گیتا کے ابواب تراجم کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

پہلا باب ارجن وشاد یوگ: اس میں ارجن کی اداسی کا فلسفہ پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا باب سانکھیہ یوگ: یہاں روح کی لافانیت اور بے لوث عمل کا فلسفہ بتایا گیا ہے۔

تیسرا باب کرم یوگ: اس میں عمل کا فلسفہ زیر بحث آیا ہے۔

چوتھا باب گیان کرم سنیاس یوگ: عرفان عمل، ترک دنیا، دھرم کا زوال اور ظہور حق کا فلسفہ، یہ سارے موضوعات اس باب کی زینت ہیں۔

پانچواں باب کرم سنیاس یوگ: اعمال کے نتیجہ سے بے فکری اور دستبرداری کا فلسفہ اس باب کا مرکزی موضوع ہے۔

چھٹا باب دھیان یوگ: اس باب میں ضبط نفس کا فلسفہ واضح کیا گیا ہے۔

ساتواں باب گیان و گیان یوگ: اس کے اندر علم و آگہی کے فلسفہ کو حوالہ قارئین کیا گیا ہے۔

آٹھواں باب کچھ برہم یوگ: لافانی اور غیر متغیر برہما کا فلسفہ اس باب میں واضح کیا گیا ہے۔

نواں باب راج ودیا یوگ: اس میں عظیم الشان علم کا فلسفہ پیش کیا گیا ہے۔

دسواں باب وبھوتی یوگ: خدا کی عظمت ورفعت کا فلسفہ اس باب کے تحت بیان کیا گیا ہے۔
گیارہواں باب وشنوروپ درشن یوگ: خدا کے جلوہ کے ظہور کا فلسفہ اس باب کا موضوع ہے۔
بارہواں باب بھگتی یوگ: بے چون وچرا اور مکمل حوالگی وسپردگی کا فلسفہ اس باب میں تفصیل سے زیر بحث آیا ہے۔
تیرہواں باب کھشتیر کھشتیر گیہ وبھاگ یوگ: مادہ اور روح اور ظاہر وباطن کا فلسفہ اس باب میں موضوع بحث ہے۔
چودہواں باب گن تریہ وبھاگ یوگ: تین خاصیتوں کی تقسیم کا فلسفہ اس میں بیان کیا گیا ہے۔
پندرہواں باب پرشوتم یوگ: اعلیٰ ترین روح کے حصول کا فلسفہ اس میں بیان کیا گیا ہے۔
سولہواں باب دیوا آسر سنپد وبھاگ یوگ: ملکوتی اور شیطانی سیرتوں کا فلسفہ اس باب میں واضح کیا گیا ہے۔
سترہواں باب شردھاتریہ وبھاگ یوگ: عقیدت کی تین قسموں کا فلسفہ اس میں بیان کیا گیا ہے۔
اٹھارہواں باب موکش سنیاس یوگ: نجات کا فلسفہ اس میں بڑی تفصیل سے اور مختلف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔[۲]

بھگوت گیتا مفکرین کی نظر میں

پروفیسر توقیر عالم فلاحی نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں ایک گرانقدر بحث یہ اٹھائی ہے کہ مفکرین کے یہاں گیتا کا مقام ومرتبہ کیا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے کئی مفکرین کی آراء نقل کی ہیں۔ ان آراء کو نقل کرنے سے قبل گیتا کا مختصر تعارف پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

> ''شری کرشن کے پیرایہ بیان میں لکھی گئی بھگوت گیتا کو ایسے ہدایت نامہ کا مقام حاصل ہے جس میں فکر وفلسفہ کی ندرتوں کو شامل کیا گیا ہے۔ دوسری صدی قبل مسیح تک ہندوستان جن فلسفیانہ افکار وخیالات اور مذہبی تعلیمات وحقائق کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، ان کا ماحصل گیتا میں آ گیا ہے۔ اگر چہ گیتا صحت وسند کی میزان پر ویدوں اور اپنشدوں کی مثیل ہے، تاہم اس کی عام

مقبولیت، علمبرداران ہندومت کا اس سے والہانہ تعلق اور موجودہ ہندومت پر اس کے دوررس اثرات ونتائج کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندو روایت کی دیگر مذہبی اور مقدس کتابیں اس کی ہم سر نظر نہیں آتیں۔''[۳]

پروفیسر توقیر عالم فلاحی نے اپنے اس قول کی تائید میں S.G.F Brandom کی کتاب A Dictionary of Comparative Religion کا درج ذیل اقتباس نقل کیا ہے۔ انگریزی عبارت کو ترک کر کے اردو ترجمہ پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

''بھگوت گیتا خدا کا گیت ہے جو بہت مشہور ہے اور ہندو روایت کے مذہبی نوشتوں میں مقبول ہے۔ اگر چہ یہ وید کے معیار کو نہیں پہنچتی کیوں کہ وید کو شرتی (الہامی) ہونے کا مقام حاصل ہے۔ لیکن ویدک شریعت کو جاننے کے لیے جو معاون تحریریں ہیں اور جنہیں سمرتی کہا جاتا ہے، ان سے اس کا تعلق ہے۔ اس کا یہ مقام اس لیے ہے کہ یہ رزمیہ ''مہا بھارت'' کی تصنیف کا ایک اہم حصہ ہے اور یہ اس میں شامل ہے اور رزمیوں کو سمرتی کا مقام دیا گیا ہے۔''[۴]

ڈاکٹر رادھا کرشنن کو سب جانتے ہیں کہ انھوں نے ہندو فلسفہ اور ہندوازم کی تجدید کے لیے نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر توقیر عالم فلاحی گیتا کی اہمیت پر ایک اقتباس ان کی معروف و متداول کتاب۔ Indian Philosophy کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔

''گیتا کا پیغام آفاقی ہے۔ مقبول ہندومت کے لیے یہ کتاب فلسفیانہ بنیاد فراہم کرتی ہے۔ مصنف وسیع تہذیب و تمدن کا علمبردار ہے اور وسیع المشرب ہے، بلکہ کسی حد تک ناقد بھی ہے۔ مصنف کسی مخصوص تبلیغی جماعت و تحریک کی قیادت نہیں کرتا ہے، وہ کسی فرقہ کو مخاطب نہیں بناتا اور نہ ہی کوئی مکتبہ فکر قائم کرتا ہے، بلکہ وہ بہنے والی ساری ہواؤں کے لیے راستے کھلا رکھتا ہے۔ گیتا اپنے فکر و خیال کی طاقت اور پرشکوہ بصیرت سے ہی محض قائل نہیں کرتی بلکہ عشق و محبت کی تپش اور روحانی جذبے کی شیرینی کے

ساتھ توجہ مبذول کراتی ہے۔''[۵]

اسی طرح پروفیسر توقیر عالم فلاحی نے ایک اقتباس گیتا اور مہابھارت کی افادیت وقدر و قیمت کے متعلق مہاتما گاندھی کا بھی نقل کیا ہے۔

''۸۹-۱۹۸۸ء میں جب پہلی بار گیتا کے درشن ہوئے، تبھی میرے دل میں یہ بات آئی کہ یہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس میں جسمانی لڑائی کے بیان کے بہانے سے ہر ایک انسان کے دل کے اندر جو لگاتار کشمکش جاری رہتی ہے، اس کا ذکر ہے۔ مہابھارت کو میں زمانہ حال کے معنوں میں تواریخ نہیں مانتا، اس کے زبردست ثبوت آدی پرو میں ہیں۔ اس میں جن شخصیتوں کا ذکر ہے وہ بنیادی طور پر تاریخی ہوسکتی ہیں، لیکن مہابھارت میں تو اس کا استعمال صرف دھرم کا درشن کرانے کے لیے ہی کیا گیا ہے۔''[۶]

یہ تمام اقتباسات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ گیتا ہندوؤں کے یہاں ان کے دینی مصادر میں بنیادی مقام کی حامل کتاب ہے۔ اس کے علاوہ گیتا کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ گیتا پر ہاتھ رکھ عدالتوں میں سچ بولنے کا حلف لیا جاتا ہے، اس کے بعد عدالت کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔

گیتا کا تصور نجات

پروفیسر توقیر عالم فلاحی نے کتاب کے آخری اور چوتھے باب میں ایک اہم ترین بحث یہ کی ہے کہ گیتا کے مطابق فلاح و بہبود اور نجات کا تصور کیا ہے؟ نیز نجات حاصل کرنے کے لیے انسان کو کن کن مراحل وعوامل سے گزرنا ہوگا یا اس کو کن چیزوں اور باتوں کی اتباع کرنی ہوگی جس کی وجہ سے وہ نجات حاصل کرسکے۔ مکتی یا نجات کے حصول میں ہندوازم میں گیتا کا جو مقام ہے اس پر پروفیسر فلاحی رقم طراز ہیں:

''نجات یا مکتی کے حصول میں گیتا کی تعلیمات کیوں کر اہم رول ادا کرتی ہیں اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ گیتا میں کوئی ایسا دانشور یا فلاسفر مخاطب نہیں ہوتا جو ظاہری یا مادی علوم وفنون کا ماہر ہو اور علمی انداز سے

مسائل کی عقدہ کشائی کا علمبردار ہو، بلکہ ایسا مرشد عارف ہم کلام ہوتا ہے جس کی روح تمام نورانی اوصاف وکمالات سے متصف ہو اور اپنے قاری یا مخاطب بھکتوں کو روح کی حقیقت سے آگاہ کراتے ہوئے مکتی ونجات کا خواہاں وخوگر بنانا چاہتا ہو۔''[۷]

چنانچہ گیتا کے مطابق مکتی یا نجات حاصل کرنے کے لیے تین عوامل واسباب ہیں:

گیان مارگ

کرم مارگ

بھکتی مارگ

گیان مارگ کے حوالے سے پروفیسر فلاحی نے لکھا ہے:

'' گیتا کے نزدیک جہالت یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اعلی دانشگاہوں سے محروم رہا اور اس نے مادی اور عصری علوم کے کسی حاذق اور ماہر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا یا عقل وفلسفہ کے لحاظ سے دیگر دانشوروں اور فلاسفہ کے بالمقابل وہ کسی بھی درجے میں قابل اعتناء نہیں ہے۔ یہاں جہالت روحانیت کا فقدان کے یا بے بصیرتی سے عبارت ہے۔ گیتا اس بات کی پر زور وکالت کرتی ہے کہ اشیاء کی حقیقت کے شعور وادراک سے محرومی میں خود غرضانہ جذبات کا بھی دخل ہے۔ اس اندھے پن یا بے بصیرتی اور روحانی کور چشمی کا قلع قمع کیا جاسکتا ہے جب کہ ان کو طہارت و پاکیزگی سے ہم کنار کیا جائے اور دلوں کی دنیا میں نئی بصیرت کی شمع فروزاں کی جائے۔ اس غایت کے حصول کے لیے جذبات وخواہشات کو فرو کر کے ذہن ودماغ کو حقیقت کی جستجو میں مشغول ومنہمک رکھا جائے۔''[۸]

کتاب کی اہمیت

پروفیسر توقیر عالم فلاحی کی زیر تبصرہ کتاب ہندوستان جیسے تکثیری اور مخلوط معاشرے میں پائی

جانے والی غلط فہمیوں اور پرخاش کو مٹانے میں نہایت اہم رول ادا کر رہی ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے اندر جو پیغام دیا گیا ہے یا گیتا جیسی دینی کتاب کے متعلق جن جذبات واحساسات کا اظہار کیا گیا ہے ان سے یقیناً ہمارے معاشرے میں بقائے باہم کا درخشاں دور قائم ہوگا۔ مذہبی حلقہ ہو، یا پھر عصری علوم وفنون سے وابستہ طبقہ، یا پھر عوام سب کی خواہش یہی رہتی ہے کہ معاشرہ میں کسی بھی نوعیت کی کوئی بھی تفریق وامتیاز اور مغایرت وتقسیم نہ ہو۔ لوگ جس طرح اپنے مذہب ودین کا احترام کرتے ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے طبقہ یا فکر ونظر سے وابستہ افراد بھی ان کے مذہب کی تعظیم و توقیر کریں تو ضروری ہے کہ ہمیں اس طرح کے لٹریچر کا فروغ کرنا ہوگا، جو ادیان ومذاہب کے حوالے سے رقم ہو چکا ہے، یا ابھی ہو رہا ہے۔ اس تناظر میں پروفیسر توقیر عالم فلاحی کی یہ کاوش نہایت اہم اور قابل قدر ہے۔ مذہبی وسماجی ہم آہنگی اور انسانی رشتوں کی عظمت کا اعتراف ہر کوئی اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ ہم اپنی تہذیب اور کلچر سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی تہذیب وتاریخ اور ان کے تمدن وثقافت سے پوری طرح آشنا ہوں گے۔ اس تناظر میں بھی یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

عظیم ہندوستانی مذاہب

پروفیسر توقیر عالم فلاحی کی مطالعۂ ادیان پر یہ دوسری وقیع تصنیف ہے۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب کی ضخامت ۳۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

پروفیسر توقیر عالم فلاحی کی یہ کتاب ہندوستانی ادیان یعنی ہندومت، سکھ مت، بدھ مت اور جین ازم کے عقائد، رسم ورواج، تہوار، مقدس شخصیات، تعارف اور دینی مصادر سے تفصیلی گفتگو کرتی ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے مصنف کی نگاہ مطالعۂ ادیان ومذاہب پر وسیع اور نہایت گہری ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں جن مسائل ومباحث کو اٹھایا ہے اس کو بڑی امانت ودیانت سے بیان کیا ہے۔ کتاب کے چند اہم محتویات حسبِ ذیل ہیں:

باب اول: ہندومت اور اس کے متعلقات

ہندومت کی بعض مقدس کتابیں اور ان کے افکار وتعلیمات

ہندومت کے بعض دیگر عقائد
ہندومت کے بعض معروف فرقے اور تحریکیں
باب دوم: بدھ مت اور اس کے اہم مشمولات
بدھ مت کا اجمالی تعارف، بدھ مت کا ادب
بدھ مت کے افکار وعقائد
بدھ مت میں پوجا و پرستش
بدھ مت میں اخلاقیات
بدھ مت میں تہوار وتقریبات
باب سوم: جین مت اور اس کے لوازم
جین مت کا اجمالی تعارف
مقدس مذہبی کتابیں
جین مت کے افکار ومعتقدات
جین مت میں عبادت و پرستش
جین مت میں اخلاقیات
جین مت کے مشہور تہوار وتقریبات
باب چہارم: سکھ مت کا اجمالی تعارف
سکھ مت کے افکار وعقائد
گرو گرنتھ صاحب
سکھ فرقے اور جماعتیں
سکھ مت کے تہوار وتقریبات

درج بالا ابواب وتراجم اور مضامین ومحتویات کی روشنی میں یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ مصنف نے اپنی اس اہم تصنیف میں ہندوستانی ادیان کی بابت تفصیلی گفتگو کی ہے۔ یعنی ہندوستانی ادیان سے متعلق پورا مواد باحثین اور قارئین کے لیے اس میں دستیاب ہے۔

ہندوستانی ادیان کا اجمالی تعارف

مصنف نے مقدمہ میں اپنی اس کتاب کا اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تعارف کو نذر قارئین کر دیا جائے تا کہ کتاب کا مکمل اور ضروری خاکہ سامنے آجائے۔

''ہندومت ان مذاہب میں ام المذاہب (Mother of the Religions) کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، اس لیے کہ بقیہ تینوں مذاہب کے بانی و پیشوا ابتدا میں برہمنی مت ہندومت کے ہی علمبردار تھے۔ ہندومت سے تعارف کے لیے اس قدیم مذہبی روایت کو پیش نظر رکھنا ہوگا جو شمالی ہندوستان کے خطہ سندھ میں آریوں کی آمد کے بعد معروف و مقبول ہوئی۔ پندرہ سو (۱۵۰۰) ق م تا چار سو (۴۰۰) ق م کے دور کو آریوں کے دور عروج کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اور اسی دور کو برہمنی مت یا ویدک مت کا نام دیا جاتا ہے۔ گویا برہمنیت یا ویدک دھرم موجودہ ہندومت کا قدیم ترین ایڈیشن ہے جسے سناتن دھرم سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ پانچ سو (۵۰۰) ق م سے لے کر چار سو عیسوی (۴۰۰) (پرانوں کے منظر عام پر آنے تک) کے دور کو برہمنی مت کی نشاۃ ثانیہ یا اس کے جدید ایڈیشن کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔''[۹]

اس مختصر تعارف سے ہندومت کی تاریخ اور اس سے جڑے اہم واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

''چھٹی صدی قبل مسیح کی پیداوار بدھ مت اپنے بانی گوتم بدھ کی طرف منسوب ہے۔ اعلی انسانی قدروں کی تشہیر و تبلیغ اور عام مخلوقات سے شفقت و محبت جیسی تعلیمات کی وجہ سے اس نے ہندوستان کی سرحدوں کو چیرتے ہوئے برما، تبت، سری لنکا، نیپال، تھائی لینڈ، ویتنام، انگلینڈ، جاپان اور چین وغیرہ ممالک میں استحکام حاصل کیا اور انہیں اپنا ماوی اور مستقر بنایا۔ اس مذہب کا امتیاز صداقت میں مضمر ہے کہ اس نے ہندومت میں رائج ذات پات کے

نظام اور مذہب پر برہمنوں کی اجارہ داری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور مذہب و تعلیم کو عام انسانوں کا سرمایہ زندگی قرار دیا۔ انسان تو انسان جانوروں تک کے لیے اس کی تعلیمات رحمت ثابت ہوئیں۔''[۱۰]

''چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندوستان کی سرزمین میں نشوونما پانے والے دو اہم مذاہب میں ایک ہے، جو جین مت کے آخری تیرتھانکر اور معروف معنوں میں اس کے بانی مہاویر جین کی طرف منسوب ہے۔ معرفت وسکون والے مسلک کا یہ علمبردار مذہب دنیاوی زندگی سے متعلق مخصوص قنوطیانہ موقف کے علاوہ شخصی تصور الہ اور ذات پات کے نظام کے معدوم ہونے سے عبارت ہے۔ ہندومت اور بدھ مت کے غلط عقائد کے پیش نظر یہ مذہب اپنے وطن مالوف کی سرحدوں سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ ہاں حلقہ احباب و متبعین کی تعداد کی افزونی کے پہلو سے یہ اپنے گھر میں ہی خوب برگ و بار لایا۔''[۱۱]

''سکھ مت ہندوستان کے بڑے مذاہب میں نوزائیدہ مذہب ہے۔ پندرہویں صدی کے اواخر میں یہ ہندوستان کی سرزمین میں نمودار ہوا۔ اس مذہب کے بانی سکھوں کے پہلے گرو، گرونانک ہیں۔ مورتی پوجا، کتب مقدسہ پر برہمنوں کی اجارہ داری، علوم و معارف پر طبقہ خواص کا تسلط، بے جا رسوم و روایات کا اسیر بننا، عملی زندگی میں مذہبی تعلیمات سے انحراف، صدیوں کی محکومیت، سنتوں کے حب الٰہی اور بھگتی مت کے مخصوص رجحانات، دراصل سکھ مت کی وجود میں آنے کے اسباب و محرکات ہیں۔''[۱۲]

متذکرہ خیالات کا اظہار مصنف نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے۔ مذاہب کا یہ تعارف گرچہ مختصر ہے لیکن اس سے ہندوستانی ادیان کی ایک واضح تصویر سامنے آتی ہے یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ متذکرہ چاروں ادیان کے وجود و بقاء اور اس کی نشر و اشاعت کے اسباب عوامل درج بالا ہیں۔ یہ مختصر اقتباسات مصنف کی قلمی روانی اور ان کی فکری جہد کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔

کتاب کے بعض مباحث کا تجزیہ

کتاب کے تمام مباحث کا تجزیہ وتحلیل کرنا تو طوالت کا باعث ہوگا البتہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض مباحث کو اجاگر کیا جائے تاکہ قارئین کے سامنے کتاب کی افادیت مزید واضح ہو سکے۔

پروفیسر توقیر عالم فلاحی نے اپنی اس کتاب میں ہندوستانی ادیان کے دینی ادب کے حوالے سے بڑی تفصیلی، تحقیقی اور علمی گفتگو کی ہے۔ چنانچہ وہ بدھ مت کے دینی ادب کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

بدھ مت کا ادب پالی زبان میں ہے، بدھ مت کی تیار کردہ ادبیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

مذہبی اور مستند ادب (Canonical Literature)

غیر مستند ادب (Non-Canonical Literarure)

مذہبی اور مستند ادب کو پٹک کہا جاتا ہے اور ان کے تین ذیلی نام حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) ونے پٹک (۲) ست پٹک (۲) ابھی دھم پٹک

پھر مصنف نے ان کی الگ الگ تعریف اور وضاحت کی ہے۔ ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

مذہبی اور غیر مستند ادب میں درج ذیل چیزیں شامل ہیں۔

وقائع نگاری (Chronicles)

تفسیریں (Commentaries)

مضامین ومقالات (Composition)

دھم پاڈ (Dhamma Pada)

اسی طرح جین مت کی مقدس مذہبی کتابوں کے متعلق مصنف نے نہایت وقیع گفتگو کی ہے۔ اس کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے:

''جین مت کی مقدس مذہبی کتابیں آگموں (Agamas)، شاستروں (Shastras)، گنی پڈاگوں (Ganipidagas)، سدھانتوں

(Siddhantas) کے نام سے جانی جاتی ہیں۔عہد جدید میں جین مت کے مطالعہ کے لیے جینی ادب اور جینی ثقافت دونوں ہی بنیادی طور پر مستند مصادر و مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔جین مت کی آگمائیں یا مقدس مذہبی کتب فی الحقیقت مہاویر کے اپنے کلام کا مجموعہ نہیں ہیں، ہاں یہ ان کے انتہائی معزز تلامذہ کی کاوشیں ہیں، اگر چہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بالواسطہ یہ سب تعلیمات آخری تیرتھنکر مہاویر جین کی طرف منسوب ہیں۔''[۱۳]

سکھ دھرم کی مقدس کتاب کا نام گرو گرنتھ صاحب ہے۔ان کی اس مقدس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر توقیر عالم فلاحی نے لکھا:

''سکھ مت اس لحاظ سے بھی روایتی اور ہمہ جہت مذاہب کے شانہ بشانہ نظر آتا ہے کہ متبعین کی کافی وشافی رہنمائی کے لیے ایک مستند اور جامع ہدایت نامہ موجود ہے، جو اگر چہ وحی الٰہی ہونے کے اعتبار سے کتاب اللہ کے ہم پلہ تو نہیں ہے، تاہم احترام ومقبولیت اور عظمت وتقدس کے اعتبار سے سکھ مت کے علمبرداروں کے نزدیک کتب الٰہی سے فروتر بھی نہیں ہے۔سکھ مت کے اس گراں قدر اور مستند نوشتہ حیات کو''آدی گرنتھ''''گرنتھ صاحب''اور''گرو گرنتھ صاحب'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے یہ''گرنتھ صاحب'' ابدی اور لازوال گرو کی مرئی شکل ہے کہ گرو نانک اور دوسرے گروؤں کے علاوہ نام دیو، روی داس، کبیر داس، بابا فرید گنج، شیخ بھکھن اور دیگر صوفی سنتوں کے روحانی ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے سکھ مت کے سچے پیرو غیر مشروط انداز سے تسلیم کرتے ہیں۔''[۱۴]

عصری معنویت

پروفیسر توقیر عالم فلاحی کی متذکرہ دونوں کتابوں کا علمی، فکری اور تحقیقی فائدہ ہونے کے ساتھ ساتھ آج کے ہندوستان میں دونوں کتابیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان ایک تکثیری سماج اور کثیر الثقافتی معاشرہ ہے، یہاں کے تقریبا ہر گاؤں، شہر اور ضلع میں ہمارا سابقہ متعدد

خیالات کے حامل اور متنوع ادیان وافکار کے متبعین سے ہر روز رہتا ہے۔ ایسے کثیر جہتی معاشرے کی باہمی اور مشترکہ ثقافتی اقدار وروایات کا تحفظ وبقاء اسی وقت ممکن ہے کہ جب ہم دوسرے ادیان کی بابت اپنا اپنا نظریہ مثبت اور متوازن رکھیں گے۔ باہم ادیان کا احترام بھی اسی وقت ممکن ہے کہ ہمارے اصحابِ قلم اور مفکرین ومدبرین ادیان مذاہب، ان کی تاریخ وتہذیب اور رسوم ورواج، عقائد ونظریات پر تحقیق وتفتیش، تصنیف وتالیف اور ترتیب تبویب کے سلسلے کو آگے بڑھانے کی سعی جمیلہ کریں گے۔ اس تناظر میں پروفیسر توقیر عالم فلاحی کی دونوں کتابیں بڑی اہمیت وافادیت کی عکاس ہیں۔ ان سے جہاں اصحاب علم اور باحثین ومحققین اپنے تصنیفی کارواں کو فروغ دیں گے تو وہیں آج سماج میں جاری نفرتوں کا بھی خاتمہ ہوگا اور ہمارے ملک میں امن وسلامتی، بقائے باہم اور مذہبی ہم آہنگی کی روشن فضا استوار ہوگی۔

ہندو دھرم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ

تقابل ادیان پر ایک اہم کتاب حافظ محمد شارق سلیم کی 'ہندو دھرم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ' کے عنوان سے دستیاب ہے۔ اس کتاب کو ۲۰۱۱ء میں قرطاس پبلشرز کراچی نے شائع کیا ہے۔ کتاب میں جن مباحث پر بحث کی گئی ہے ان سے کتاب کی علمی حیثیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ قارئین کی دلچسپی کے لیے کتاب کے مندرجات ومشمولات پیش کیے جارہے ہیں۔ یہ کتاب تبصرہ، ضمیمہ اور دس ابواب پر مشتمل ہے۔ جن کی فہرست حسبِ ذیل ہے۔ باب اول تعارف مذاہب، باب دوم کتب مقدسہ، اس میں ہندو مذہب اور اسلام کے مصادر ومآخذ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ باب سوم تصور خدا، اس میں دو فصلیں ہیں، ہندو دھرم میں تصور خدا اور اسلام میں تصور توحید، باب چہارم عبادات، ہندو دھرم اور اسلام کے نظام عبادت پر گفتگو کی گئی ہے۔ باب پنجم معاشرتی نظام، اس میں بھی اسلام اور ہندو دھرم کے معاشرتی نظام پر بحث کی گئی ہے۔ باب ششم عقیدہ بعد الموت اور نجات۔ اس کے تحت ہندو دھرم اور اسلام کے عقیدہ بعد الموت اور نجات کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ باب ہشتم سائنس، اس میں دو فصلیں ہیں، پہلی ہندو دھرم اور کائنات، دوسری، کائنات اور جدید سائنس، باب نہم احکام اور تعلیمات، پہلی فصل ہندو دھرم کی تعلیمات اور دوسری فصل، اسلام کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ باب دہم اسلام اور ہندو دھرم کا تعلق، اس کی بھی حسب سابق دو فصلیں ہیں۔ ہندو دھرم میں اسلام کا ذکر اور اسلام میں ہندو دھرم کا

ذکر صفحات کی تعداد ۳۴۷ ہے۔

سبب تالیف

مصنف نے لکھا ہے:

''اردو زبان میں ادیان پر لکھنے کا رجحان زیادہ پرانا نہیں ہے۔ باقاعدہ تقریباً اٹھارویں صدی عیسوی سے اردو زبان میں مذاہب عالم پر لکھنے کا رجحان قائم ہوا، لیکن اردو زبان میں عیسائیت پر اچھا مواد موجود ہے۔ ہندو مت پر چند کتابیں ہی دستیاب ہیں لیکن ان میں ہندومت کی کتب مقدسہ میں درج مذہب کے بجائے مقامی اور ہندوستانی کلچر پر زیادہ مواد ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ان میں صحائف کے حوالے کم اور منطقی کلام زیادہ ملتا ہے۔ چنانچہ ہم کہ سکتے ہیں کہ ہندودھرم اور اسلام کے تقابل پر مبنی تحقیقی مواد سے اردو ادب اب تک محروم نظر آتا ہے۔ اس موضوع پر آخری معیاری کتاب ''تحفة الهند'' لکھی گئی ہے۔ لیکن اسے بھی برسوں گزر چکے ہیں اور اس کتاب کا انداز تبصرانہ ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر مکمل اور جامع کتاب کی کمی کافی عرصے سے شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ اس کے لیے خدا نے اس بندے کے دل میں اس موضوع پر لکھنے کا خیال ڈالا۔''[۱۵]

مصنف نے مذکورہ اقتباس میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہندو مذہب کے حوالے سے اُردو میں کوئی بھی وقیع کام دستیاب نہیں ہے اس لیے اس کمی کو دور کرنے کے لیے اس موضوع پر کام کرنے کی جسارت کی۔ مصنف موصوف کے اس دعویٰ سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس سے قبل ہندودھرم پر کئی اہم اور علمی کتابیں آچکی ہیں۔ ہوسکتا ہے۔ مصنف کی وہاں تک رسائی نہ ہوئی ہو۔

ہندومت میں تخلیق کائنات کا تصور

یوں تو پوری کتاب قابل مطالعہ اور لائق تحسین ہے۔ لیکن تمام مباحث کا ذکر طوالت کا باعث

ہوگا اس لیے اس کتاب کے اہم عناوین پر گفتگو کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کائنات کی تخلیق کے متعلق ہندو دھرم میں متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔ حتی کہ تمام ہندومت کے بنیادی ماخذ ومصادر کا الگ الگ نظریہ ہے۔ لیکن ذیل میں فاضل مصنف نے رگ وید باب دس اور شلوک ۱۲۹ کے حوالے سے لکھا ہے:

''اس وقت عدم تھا اور نہ وجود۔ نہ عالم خلا کے بانی۔ اور نہ آسمان تھا۔ کیا چیز ان کا احاطہ کرتی اور وہ سب کچھ کہاں قائم ہوتا؟ اس وقت پانی بھی نہیں تھا۔ اس وقت نہ موت تھی نہ ابدی حیات اور نہ دن رات کا کوئی فرق تھا۔ بے حرکت نفس اپنی قدرت کے ساتھ وہی ایک تھا، اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہ سب کل کائنات بے نام ونشان اور غیر موجود صورت میں تھی۔ اس اولین تخم وروح میں خواہش پیدا ہوئی جسے عقلمندوں نے اپنی دانائی سے معلوم کرلیا کہ وہ عدم اور وجود کا باہم اتصال ہے۔ ان کی دانش اور اس کے اوپر قدرت تھی۔ کون فی الحقیقت یہ جانتا ہے اور کون اسے یہاں بیان کرسکتا ہے کہ کہاں سے یہ دنیا پیدا ہوگئی۔ اور کہاں سے یہ خلقت وجود میں میں آئی۔ دیوتا تو اس دنیا کی پیدائش کے بعد کے ہیں تو پھر کون جانتا ہے کہ کب وہ پہلے پہل وجود میں آئی۔ وہ جو اس خلقت کا اولین سبب ہے۔ اس نے یہ سب بنایا بھی ہے یا نہیں۔ وہ کہ جس کی آنکھ عرش اعلی سے دنیا پر حکومت کرتی ہے۔ وہ فی الحقیقت اس کو جانتا ہے یا وہ بھی نہیں جانتا۔''[۱۶]

اس نظریہ سے ایک بات تو یہ ثابت ہوگئی کہ ہندو دھرم میں کائنات کی تخلیق کے متعلق کوئی ٹھوس یا مستحکم نظریہ نہیں ہے بلکہ متضاد خیالات کا مرقع ہے۔ رگ وید کے اسی باب کے شلوک ۹۰ میں یہ بھی لکھا ہے:

''جب دیوتاؤں نے پہلے انسان کی اپنے شکار کی حیثیت سے قربانی کی۔ موسم بہار کو پگھلا کر مکھن دیا گیا۔ گرمی کو ایندھن اور خزاں کو اس کا چڑھاوا بنایا گیا۔ اس کو قبول کرنے والے سے منجمد مکھن یکجا ہوگیا، اسی سے اس نے مرغان ہوا۔ درندوں اور چرندوں کو بنایا۔''[۱۷]

اسی طرح ہندومت میں انسانی تخلیق کے متعلق درج ذیل چیزیں ملتی ہیں۔

''ابتداء میں ایک ہی روح تھی۔ یہ روح جب اپنے اردگرد دیکھتی تو اسے اپنے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ نیز روح پکارتی! یہاں میں ہوں، تب اس لمحے سے 'میں' کا تصور قائم ہوا اور 'میں' نے وجود پایا۔ وہ تنہا تھا اسی لیے اب بھی تنہائی میں (انسان) خوف محسوس کرتے ہیں۔ تب اس نے سوچا کہ میں تنہا کیوں خوف زدہ ہوں؟ کیوں کہ میرے سوا کچھ نہیں ہے اس طرح خوف دور بھاگ جائے گا۔ وہ خوش نہیں تھا اس لیے آج بھی کوئی انسان اکیلا ہوتا ہے تو وہ خوش نہیں ہوتا۔ وہ روح اول ایک ساتھی کی خواہشمند تھی۔ اس لیے ایک مرد اور ایک عورت کو مربوط صورت میں بنایا۔ پھر اسے دو حصوں میں علیحدہ کیا، مرد شوہر بن گیا اور عورت بیوی۔ یعنی ابتداء میں مرد اور عورت ایک ہی جسم میں تھے، پھر میاں بیوی نے جفتی کی اور ان سے مخلوق پیدا ہوئی۔ تب اس عورت نے سوچا کہ میں اور میرا خاوند ایک ہی روح سے پیدا ہوئے ہیں اس لیے ہمیں آپس میں جفتی کرنا غلط ہے۔ اس لیے اس نے خود کو چھپالیا اور گائے بن گئی۔ اس کا خاوند (منو) بیل بن گیا اور انھوں نے پھر صحبت کی اس سے حیوان پیدا ہوئے، پھر وہ گھوڑی بن گئی اور وہ گھوڑا بن گیا اور ان کے اختلاط سے گھوڑے پیدا ہوئے۔ اس طرح تمام زندہ مخلوق پیدا ہوئی، یہاں تک کہ کیڑے مکوڑے ایسے ہی پیدا ہوئے۔''[۱۸]

گویا ہندو مذہب میں یہ کہانی ہے کائنات کے نشو ونما کی۔ ان سب باتوں پر یقین کرنا بڑا مشکل ہے لیکن ہندوازم کی اپنی روایات ہیں۔ اس کے اپنے نظریات ہیں۔ وہ ایک تہذیب ہے۔ اس لیے ہم اس نظریہ پر تو چوٹ نہیں کرنا چاہتے لیکن یہاں یہ ضرور بتانا چاہیں گے کہ اس بابت اسلام کا کیا موقف ہے۔

اسلام میں تخلیق کائنات کا تصور

اسلام کا نظریہ واضح کرنے سے قبل یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسلام میں ہندو دھرم کی

طرح کائنات کی تخلیق کے متعلق مبہم یا غیر واضح نظریہ نہیں پایا جاتا ہے۔ اس لیے فاضل مصنف نے قرآن کریم کی درج ذیل آیات سے استدلال کیا ہے۔ چنانچہ سورہ ہود آیت ۷ میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے۔ ''اللہ ہی وہ ہے جس نے چھ یوم میں آسمان وزمین کو پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا'' دوسری جگہ ارشاد ہے۔ ''کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے تو ہم نے انہیں جدا جدا کر دیا اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائی پھر کیا یقین نہیں کرتے''۔ (سورۃ الانبیاء: ۳۰) ایک جگہ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ ایک دھواں سا تھا تو اس نے زمین وآسمان سے کہا تم اطاعت کرو'' (سورۃ حم السجدۃ: ۱۱)

تخلیق انسان کے متعلق بھی اسلام کا نقطہ نظر بالکل واضح اور شفاف ہے۔ کیوں کہ انسان کی ابتداء آدم اور ان کی بیوی حوا سے ہوئی۔ قرآن میں اس مسئلہ کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

> ''اے لوگوں! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں پیدا کیا ایک جان سے، اس سے اس کا جوڑا بنایا۔ پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد وعورت پھیلا دیے۔''[19]

اب ذرا دونوں ادیان پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ کہ ہندومت میں تخلیق کائنات اور اس کے فروغ کا نظریہ نہ صرف غیر واضح ہے بلکہ اس پر یقین کرنا بھی دشوار کن امر ہے۔ برعکس اس کے کہ اسلام نے تخلیق کائنات کے مسئلہ کو انتہائی شفافیت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جس میں کسی طرح کی جھول نہیں ہے اور یہ ایسا واضح نظریہ ہے جو ہر کس وناقص کی سمجھ میں بخوبی آسکتا ہے۔

مذاہب کا باہمی تعلق

کتاب کے آخری باب میں مصنف نے دونوں ادیان کا باہم تعلق بتانے کی کوشش کی ہے۔ اور انتہائی اہم اور علمی گفتگو پر مشتمل ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندو دھرم میں اسلام کا ذکر ہے؟ اس سلسلے میں چند چیزیں پیش ہیں۔ ہندو منابعات میں بیت اللہ کا ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ اتھر وید میں مذکور ہے:

> ''برہما (خالق) اس گھر میں رہتا ہے جو جنت کی روشنیوں سے روشن اور

مقدس ارواح (فرشتوں) سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں لوگوں کو روحانی سکون ملتا ہے۔''[۲۰]

اسی طرح اتھروید کے دوسرے شلوک میں ہے۔

''خواہ وہ اونچائی پہ بنا ہو، اس کی دیواریں سیدھی ہوں یا نہیں، لیکن خدا اس کے ہر زاویے میں دیکھتا ہے۔ یہ بات خدا کے گھر کو جاننے والے جانتے ہیں کیونکہ وہاں خدا کو یاد کیا جاتا ہے۔''[۲۱]

فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں ایک مدعا یہ اٹھایا ہے کہ یہودیوں، عیسائیوں اور صائبین کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے علاوہ ازیں ہندوؤں کا تذکرہ ان کے نام سے نہیں ہے۔ اس ضمن میں مصنف کا کہنا یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے ہر قوم میں نبی بھیجے ہیں لہٰذا ہوسکتا ہے قوم ہنود میں بھی کوئی نبی آیا ہو۔ انھوں اپنے دعویٰ کے استدلال میں قرآن کریم کی درج ذیل آیات پیش کی ہیں۔ ''یقیناً ہم مبعوث کر چکے ہر امت میں رسول کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچو''۔ (سورہ نحل: ۳۶) اسی طرح اللہ تعالیٰ دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہے۔ ''یقیناً ہم آپ سے پہلے بھی بہت رسول بھیج چکے ہیں ان (رسولوں) میں بعض کا حال ہم نے آپ سے بیان کیا ہے اور بعض کا حال ہم نے آپ سے بیان ہی نہیں کیا''۔ ہوسکتا ہے کہ قوم ہنود میں کسی نبی کو مبعوث کیا گیا ہو لیکن اس کا تذکرہ نہیں کیا ہو۔ اس کے علاوہ مصنف نے ابوالحسن مسعودی کے حوالے سے لکھا ہے:

''صائبین سے مراد ہنود ہی ہوں کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق یہ وہ مذہب تھا جو زرتشت کے ظہور سے پہلے ایران میں رائج تھا''۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ تحقیق بھی پیش کی ہے کہ یہ وہ مذہب ہے جسے 'بوذاسب' نے 'طہورس' کے زمانہ میں پیش کیا تھا بوذاسب اور زرتشت کا زمانہ بہت ہی قریب چھٹی صدی قبل مسیح ہے۔، بوذاسب کا مذہب کیا تھا''۔ اس بارے میں اہل علم جانتے ہیں کہ ویدک دھرم تھا" مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندو مذہب کا تذکرہ اگرچہ صراحتاً نہیں آیا ہے البتہ محققین کی ایک جماعت کے مطابق یہ واضح ہے کہ صابی ہی اہل ہنود ہیں۔''[۲۲]

کتاب کی اہمیت

حافظ محمد شارق کی اس کتاب میں کئی اہم گوشوں پر گفتگو کی گئی ہے جن کو طوالت کے باعث ترک کر دیا گیا ہے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ اس کتاب کے مباحث انتہائی اہم اور قابل مطالعہ ہیں۔ جن امور و مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے ان کو ہندو دھرم کے منابعات و مصادر سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ کتاب میں اسلوب تحقیق متوازن اور سنجیدہ ہے۔ جارحانہ اسلوب سے گریز کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور اہم بات ہے کہ اسلام اور ہندو مذہب کا تقابل کیا گیا ہے۔ پھر وجہ ترجیح بھی بیان کی گئی ہے اور جہاں جہاں مماثلت و یکسانیت دونوں مذاہب میں پائی جاتی ہے اس کو بھی بتایا گیا۔ چنانچہ وہ تخلیق کائنات کے باب میں لکھتے ہیں:

> ''اپنشد، مہابھارت، وید اور قرآن مجید علم کائنات کے بابت کیا بتاتے ہیں، یہ ہم نے مختلف حوالوں کے ساتھ پڑھا اور جانا۔ ہم یہاں پھر سے یاد دہانی کرادیں کہ وید، اپنشد اور قرآن کو جدید سائنس کی روشنی میں جانچنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ کتابیں خدائی کلام ہیں تو کائنات کے متعلق ان میں کوئی غلط مفروضہ ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ خدا ہی اس کائنات کا خالق ہے اس کے ذاتی کلام میں کسی قسم کی سائنسی اغلاط کا کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ ہم نے یہاں دونوں مذاہب کے حوالے بیان کیے ہیں۔ اب کون سے مذہب نے اسے من وعن سائنسی نظریات کے عین مطابق بیان کر کے خود کو حق ثابت کیا اس بات کا بلاتعصب یہ فیصلہ قارئین کی ذمہ داری ہے۔''[۲۳]

گویا یہ بات تو یقینی ہے کہ فاضل مصنف نے جو نکات و شواہد تخلیق کائنات کے حوالے سے بیان کیے ہیں ان میں اسلامی تعلیمات بالکل واضح ہیں اور جدید نظریات سے بھی ہم آہنگ ہیں البتہ جو شواہد ہندومت کے ہیں وہ انتہائی مبہم اور جدید افکار سے بھی متغایر نظر آتے ہیں۔

حواشی

۱۔ قرآن اور گیتا کا تصور فلاح — پروفیسر توقیر عالم فلاحی (۲۰۱۴ء) ص: ۶۷-۶۸
۲۔ ایضاً، ص: ۶۰
۳۔ ایضاً، ص: ۶۰-۶۱
۴۔ ایضاً، ص: ۶۲
۵۔ ایضاً، ص: ۶۳
۶۔ ایضاً، ص: ۷۷
۷۔ ایضاً، ص: ۷۹
۸۔ عظیم ہندوستانی مذاہب — پروفیسر توقیر عالم فلاحی، ناشر مصنف (۲۰۱۵ء) ص: ۱۵-۱۶
۹۔ ایضاً، ص: ۱۶
۱۰۔ ایضاً، ص: ۱۷
۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۷
۱۲۔ ایضاً، ص: ۱۸۳-۱۸۸
۱۳۔ ایضاً، ص: ۲۳۹-۲۴۳
۱۴۔ ایضاً، ص: ۳۲۶-۳۲۸
۱۵۔ ہندو دھرم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ — حافظ محمد شارق سلیم، قرطاس پبلشرز [کراچی، پاکستان] (۲۰۱۱ء) ص: ۱۶
۱۶۔ ایضاً، ص: ۲۵۴
۱۷۔ ایضاً، ص: ۲۵۴-۲۵۵
۱۸۔ ایضاً، ص: ۲۵۷
۱۹۔ ایضاً، ص: ۲۹۲
۲۰۔ ایضاً، ص: ۲۹۲
۲۱۔ ایضاً، ص: ۱۹۷
۲۲۔ ایضاً، ص: ۱۹۷
۲۳۔ ایضاً

(ختم شد)

(سہ ماہی)

اسلام اور عصرِ جدید

کے خاص شمارے

سیرت ومغازی کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین............۲۰۰روپے
اسلامی تہذیب وتمدن (دورِ جاہلیت سے آغاز اسلام تک)............۳۰۰روپے
نذرِ علی محمد خسرو..۱۰۰روپے
بیاد خواجہ غلام السیّدین..۱۰۰روپے
بیاد پروفیسر مشیر الحق..۲۰۰روپے
افکارِ ذاکر..۱۵۰روپے
مولانا عبیداللّٰہ سندھی..۲۰۰روپے
ڈاکٹر سید عابد حسین اور نئی روشنی..........................۲۵۰روپے
مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت..۱۵۰روپے
نذرِ رومی..۲۰۰روپے
قرآن مجید، مستشرقین اور انگریزی تراجم..........................۱۰۰روپے
پیکر دین ودانش: امام غزالیؒ..۳۰۰روپے
معلمِ عصر: سعید نورسیؒ..۲۰۰روپے

ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی ۱۰۰روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۱۵فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

رسالہ جامعہ

کے خاص شمارے

جشن زریں نمبر..... ۱۰۰روپے

ڈاکٹر مختار احمد انصاری..... ۱۰۰روپے

سالنامہ ۱۹۶۱ء..... ۱۰۰روپے

اسلم جیراجپوری نمبر..... ۱۰۰روپے

پروفیسر محمد مجیب نمبر..... ۱۰۰روپے

مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں..... ۱۵۰روپے

پریم چند کی یاد میں..... ۱۰۰روپے

نہرو نمبر..... ۱۰۰روپے

جامعہ پلاٹینم جوبلی نمبر..... ۱۰۰روپے

ابوالکلام آزاد نمبر(پہلی اور دوسری جلد)..... ۳۰۰روپے

خواجہ حسن نظامی اور اُردو نثر..... ۱۰۰روپے

خلیل الرحمن اعظمی کی یاد میں..... ۱۰۰روپے

بلونت سنگھ کی یاد میں..... ۱۰۰روپے

ابوالفضل صدیقی کی یاد میں..... ۱۵۰روپے

نذرِ انیس..... ۳۰۰روپے

گاندھی اورگاندھیائی فکر..... ۳۰۰روپے

ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی (۱۹۶۱ء تا حال) فی ۱۰۰/روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۲۵ فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطـــہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

Vol. LV I No. 3 I R.N.I. No. 17614/69 I July 2023

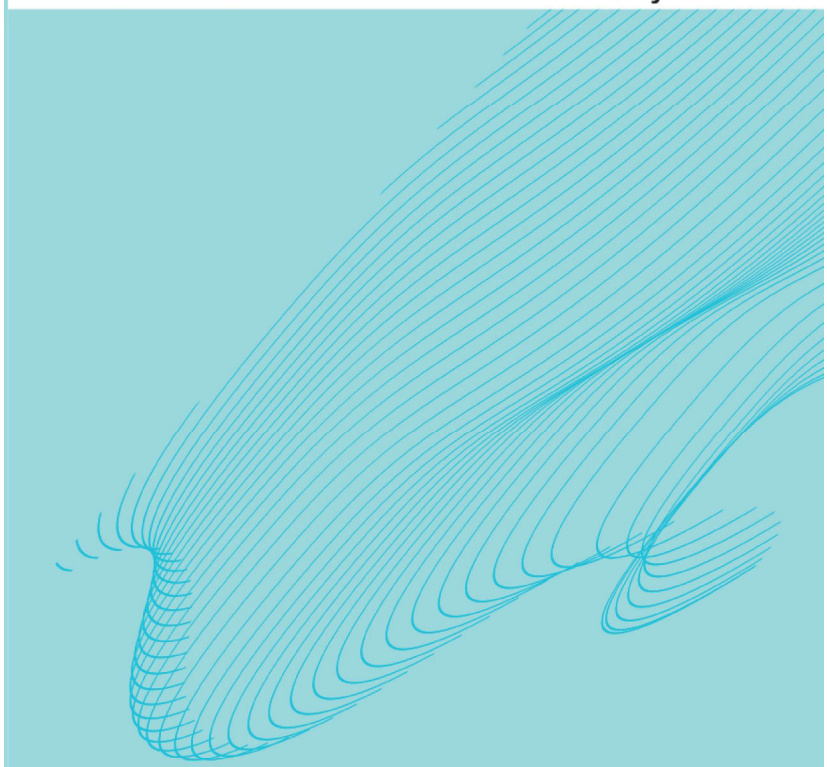

ISLAM AUR ASR-I-JADEED

ISSN 2278-2109

Zakir Husain Institute of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Phone: 011-26841202